

مئی 2014ء

تعلیم و تربیت



WWW.PAKSOCIETY.COM

باطل دوستی پسند ہے، حق لا شریک ہے
شرکت میاں حق و باطل نہ کر قیول!

تعلیم و تربیت

پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا

بچوں کا محبوب رسالہ



اس شمارے میں

مئی 2014ء

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

کسی بادشاہ نے رسول پاک ﷺ کی خدمت میں ایک طبیب بھیجا کہ ضرورت کے وقت آپ کی جماعت کا علاج و معالجہ کیا کرے۔ طبیب مدتوں مدینے میں حاضر رہا مگر کسی شخص نے اس سے علاج کے لیے رجوع نہ کیا۔ طبیب اس مسلسل بے کاری سے عاجز آ گیا اور آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ خاک سار اتنی مدت سے صرف آپ کے جان نثاروں کی خدمت کے لیے حاضر ہے مگر اس عرصے میں میری طرف کسی نے بھی توجہ نہیں دی۔

حضورؐ نے فرمایا۔ ”ان لوگوں کا قاعدہ یہ ہے کہ جب تک بھوک غالب نہ ہو، کھانے کو ہاتھ نہیں لگاتے اور ابھی پیٹ نہیں بھرتا کہ ہاتھ اٹھا لیتے ہیں۔“ حکیم نے کہا۔ ”بے شک تندرستی کا اصل راز یہی ہے جس کے ہوتے ہوئے میری حاضری بے کار ہے۔“ اس کے بعد حکیم نے آداب بجالا کر وطن کی راہ لی۔

پیارے بچو! ہر چیز میں اعتدال رہے تو کوئی بگاڑ پیدا نہیں ہوتا۔ اعتدال یا میانہ روی انسان کو بہت سی مشکلات سے بچاتی ہے۔ کھانے پینے میں اعتدال صحت کے لیے بہت ضروری ہے۔ اب جب کہ موسم گرما کا آغاز ہونے والا ہے۔ اس موسم میں خاص طور پر کھانے پینے میں احتیاط برتیں۔ گرمی کی شدت میں پیاس تو لگتی ہے لیکن پانی پینے میں بھی احتیاط کریں۔ زیادہ ٹھنڈا پانی پینے سے گریز کریں۔ دھوپ میں نکلنا پڑے تو سر اور گردن کو ڈھانپ لیں تاکہ لونہ لگے۔ بازار کی ناقص اشیاء مت کھائیں۔ 28 مئی کا دن ہمارے وطن کی تاریخ کا ایک یادگار اور اہم دن ہے۔ اس دن پہلی اسلامی مملکت پاکستان نے چاغی کے مقام پر ایٹمی دھماکہ کیا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ پاکستان کو ہر میدان میں استحکام بخشے اور پاکستان دن دگنی رات چوگنی ترقی کرے۔ آمین!

بحیثیت طالب علم آپ کا فرض ہے کہ آپ اپنی تعلیم پر بھرپور توجہ دیں تاکہ ملکی ترقی میں حصہ لے سکیں اور یہ تب ہی ممکن ہے جب آپ محنت اور دل لگا کر پڑھیں گے۔ تعلیم و تربیت کی پسندیدگی کے بے شمار خطوط موصول ہوتے ہیں جن میں آپ کی آراء و تجاویز بھی ہوتی ہیں۔ اس ماہ کا رسالہ پڑھیے اور اپنی تنقید و تجاویز سے آگاہ کریں۔

آپ خوش رہیں، شاد رہیں اور آباد رہیں۔ فی امان اللہ!

(ایڈیٹر)

سرکولیشن اسٹنٹ

محمد بشیر رائی

اسٹنٹ ایڈیٹر

عابدہ اصغر

ایڈیٹر، پبلشر

ظہیر سلام

1	مدیر	اداریہ
2	ضیاء الحسن ضیا	حمد و نعت
3	محمد طیب الیاس	درس قرآن و حدیث
4	قرۃ العین ہاشمی	شیخ ازل
9	راشد علی نواب شاہی	پیارے اللہ کے.....
11	عفیہ طاہرہ	اندھیر گری چوہٹ راج
13	خزیر سلیمان	قدرت کا رجسٹر
15	ادارہ	کھیل دس منٹ کا
16		دودھ اور انسانی صحت
17	نخے قارئین	بوجھ تو جانیں
18		ایک شہر، دو براعظم.....
19	لیاقت علی	سنہری جزیرہ
24	ادارہ	دماغ لڑاؤ
25	پر عزم قارئین	میری زندگی کے مقاصد
26	نخے قارئین	مختصر مختصر
28	زبیدہ سلطانہ	محاورہ کہانی
29	ڈاکٹر طارق ریاض	بچوں کا انسائیکلو پیڈیا
31	ادارہ	معلومات عامہ
32	محمد بشیر رائی	سر پر کھڑا ہے امتحان
34	ادارہ	اوچل خاکے
35	نخے باذوق قارئین	آئیے مسکرائیے
36		ذائقہ کارز
37	رانا محمد شاہد	ٹیپو سلطان
40	صبا جاوید	انوکھی سزا
43	عزیز اثری	دولت پور میں.....
48	نخے ادیب	آپ بھی لکھیے
51	صغیر حسین جمجوہ	دعوت
53	غلام حسین مبین	سنہرے لوگ
55	نخے قارئین	ایڈیٹر کی ڈاک
57	نخے کھوجی	کھوج لگائیے
58	نسرین شاہین	تیرا کی
61	احمد ندان طارق	یتیم
64	ادارہ	بلاعتوان

اور بہت سے دل چپ تراشے اور سلسلے

سرورق: شیر میسور ٹیپو سلطان

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور۔

پرنٹر: ظہیر سلام

سالانہ خریدار بننے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت پیشگی بینک ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت

مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور۔

میں سرکولیشن منیجر: ماہنامہ ”تعلیم و تربیت“ 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور کے پتے پر ارسال فرمائیں۔

UAN: 042-111 62 62 62 Fax: 042-36278816

E-mail: tot.tarbiatts@gmail.com

tot tarbiatts@live.com

سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہ قائد اعظم، لاہور۔

فون: 36361309-36361310 فیکس: 36278816

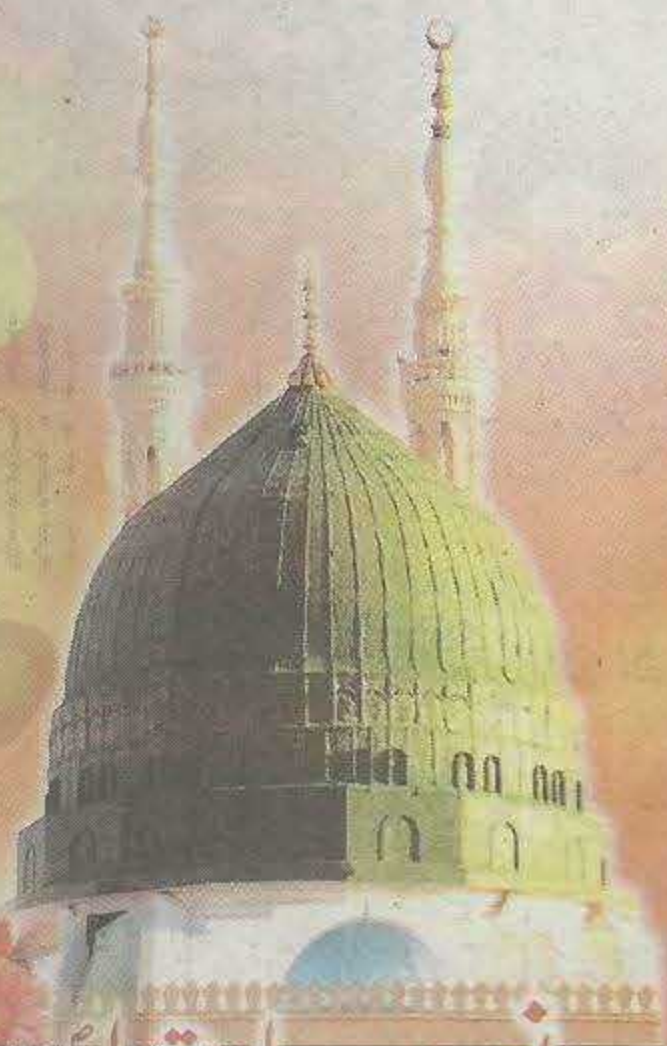
ایشیاء، افریقا، یورپ (ہوائی ڈاک سے) = 2400 روپے۔

پاکستان میں (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک) = 850 روپے۔

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا، مشرق بعید (ہوائی ڈاک سے) = 2800 روپے۔

مشرق وسطی (ہوائی ڈاک سے) = 2400 روپے۔

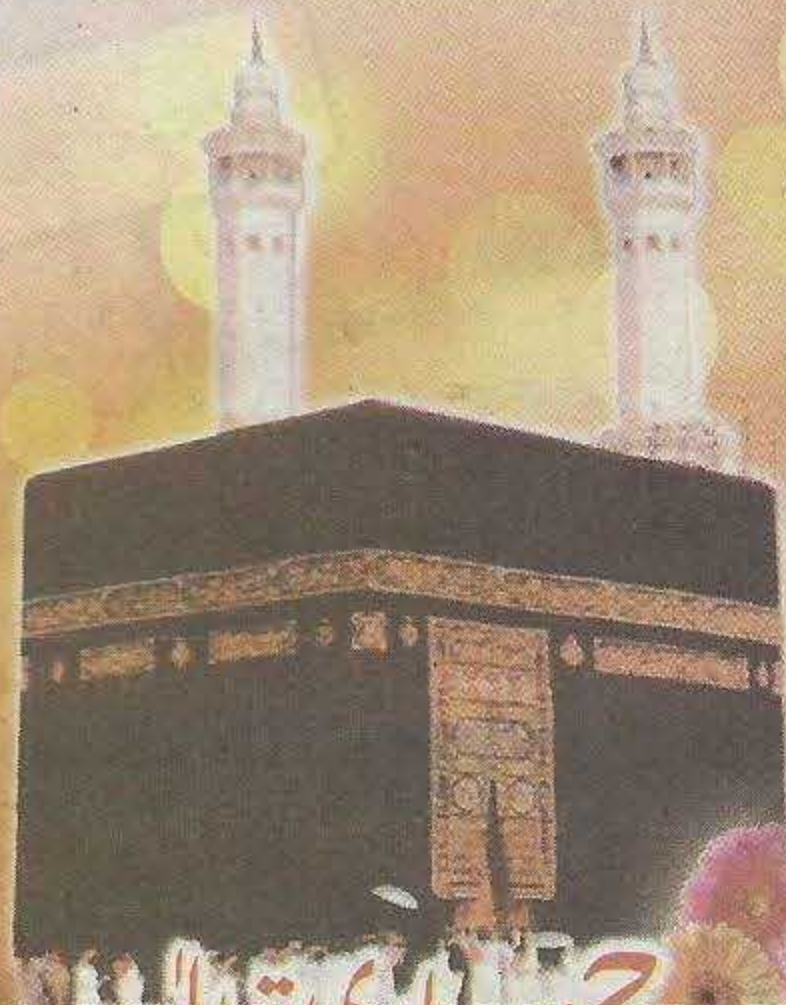
قیمت فی پرچہ: 30 روپے



نعت رسول مقبول

اسم احمد جو لب پہ آیا ہے
دل نے کتنا سکون پایا ہے
خلق سرور پہ جان و دل صدقے
دشمنوں کو گلے لگایا ہے
احمد مصطفیٰ رسول کریم
مرتبہ کس نے ایسا پایا ہے
برکتیں ہیں یہ اسم احمد کی
ابر رحمت سروں پہ چھایا ہے
آپ کے ہر عمل نے یا شہ دیں
سیدھا رستہ ہمیں دکھایا ہے
آپ نے پیار کا سبق دے کر
نفرتوں کا چلن مٹایا ہے
آپ کے نور سے ضیا کا دل
میرے سرکار جگمگایا ہے

ضیاء الحسن ضیا



حمد باری تعالیٰ

بگڑے کام بنانے والا اللہ ہے
بیڑے پار لگانے والا اللہ ہے
وہ تکلیف میں راحت دیتا ہے سب کو
دُکھ میں سکھ پہنچانے والا اللہ ہے
بسی ہوئی ہے اس کی خوشبو ہر گل میں
گلشن کو مہکانے والا اللہ ہے
اس کے نور سے سورج چاند منور ہیں
ذروں کو چمکانے والا اللہ ہے
طاقت وہ دیتا ہے مردہ جسموں کو
بجھتے دیپ جلانے والا اللہ ہے
صحرا صحرا اس نے پھول کھلائے ہیں
گل سنسار سجانے والا اللہ ہے
حمد اسی کی ضیا کے لب پر ہے ہر دم
سب پہ کرم برسانے والا اللہ ہے

اچھے اور بُرے ساتھی کی مثال

گے۔ اس طرح اچھے اور نیک لوگوں کے پاس بیٹھنے سے آپ کو دین و دنیا ہر لحاظ سے فائدہ حاصل ہوتا ہے۔

لوہار بھی دھونکتا ہے، اس کے لیے آگ جلاتا ہے اور دھوئیں میں شرابور ہوتا ہے۔ اگر آپ اس کے پاس بیٹھیں گے تو اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں کپڑے جل ہی نہ جائیں۔ اگر کپڑے نہ بھی جلیں مگر اس بھی اور دھوئیں کی گندی بدبو سے آپ کا سانس لینا دوبھر ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر آپ بد اخلاق اور بُرے دوستوں کے ساتھ میل جول رکھیں گے اور ان کے ساتھ انھیں بیٹھیں گے تو انہیں کے اطوار و عادات آپ کے اندر پیدا ہو جائیں گے، بُرے کاموں سے محبت پیدا ہوگی۔ چاہے آپ بُرائی نہ بھی کریں لیکن بُری صحبت کا اثر ضرور حاصل ہوگا اور ایک وقت آئے گا کہ آپ بھی انہی کے رنگ میں رنگے جائیں گے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ

صحبت صالح ترا صالح کند
صحبت طالح ترا طالح کند

اچھی صحبت اچھا بناتی ہے اور بُری صحبت بُرا بناتی ہے۔

اس لیے اللہ رب العزت کا بھی ارشاد ہے کہ ”اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کے ساتھ ہو جاؤ۔“

(التوبہ، آیت: 119)

اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”انسان اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے، سو تم میں سے ہر شخص غور کرے کہ اس کی دوستی کس سے ہے۔“

(ترمذی، ابواب الزہد: 2378)

اس حدیث سے سبق لینا چاہئے اور اچھے لوگوں سے دوستی کرنی چاہیے۔

☆☆☆

پیارے بچو!

آپ نے سنا ہوگا کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ یعنی جب آپ اچھے اور نیک لوگوں کے پاس بیٹھتے ہیں تو اچھائی اور نیکی کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں اور جب آپ بُرے اور گندے لوگوں کے پاس بیٹھتے ہیں تو بُرائی اور گندگی سے آلودہ ہو جاتے ہیں۔ اچھے اور عمدہ اخلاق کے حامل لوگوں کے پاس بیٹھ کر اچھے اور عمدہ اخلاق حاصل کیے جاتے ہیں جب کہ بد اخلاق لوگوں کے پاس بیٹھنے سے اخلاق گھٹیا ہو جاتے ہیں۔

نبی پاک ﷺ نے اس بات کو ایک بہت عمدہ مثال سے سمجھایا ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”اچھے اور بُرے ساتھی کی مثال مشک والے اور بھیڑی کو دھونکنے والے کی طرح ہے۔ مشک والا یا تو آپ کو اس مشک میں سے حصہ دے دے گا یا آپ اس سے مشک خرید لیں گے یا کم از کم اس کی عمدہ سی خوشبو سونگھ لیں گے اور بھیڑی دھونکنے والا یا تو آپ کے کپڑے جلا دے گا یا آپ اس سے گندی بدبو سونگھیں گے۔“

(بخاری، کتاب البیوع، باب فی العطار و بیع المسک: 2101، مسلم، کتاب البر والصلة والادب، باب استحباب مجالسة الصالحین: 2628)

مشک ایک عمدہ اور قیمتی خوشبو ہے جس کو کستوری بھی کہا جاتا ہے۔ اگر کسی کے پاس یہ عمدہ خوشبو ہو تو آپ اس خوشبو سے مختلف طریقوں سے نفع اٹھا سکتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ یا تو یہ عمدہ خوشبو وہ آپ کو ہدیہ میں دے دے گا یا آپ اس سے یہ عمدہ خوشبو خرید لیں گے اور اگر ان دونوں میں سے کوئی بھی صورت درپیش نہ ہو تو اس خوشبو کی مہک سے آپ ضرور ہی فرحت و سرور حاصل کریں

شمع ازل



قرۃ العین خرم ہاشمی

تھے مگر سیٹھ قاسم علی بضد تھے کہ وہ ایک خطرناک بیماری کا شکار ہیں۔ ان کے تینوں بیٹے بھی باپ کی اس عجیب و غریب منطق پہ حیران ہوتے تھے اور ہر طرح سے اپنے باپ کو سمجھانے کی کوشش کرتے تھے مگر بے سود..... اب انہیں لگنے لگا تھا کہ بڑھتی عمر کے ساتھ ساتھ، سیٹھ قاسم علی کسی ذہنی عارضے کا شکار ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کے بیٹوں نے ملک کے معروف و نامور ماہر نفسیات سے رابطہ کیا۔ سب نے انہیں بہتری کی امید دلائی۔

اب اصل مسئلہ سیٹھ قاسم علی کو اس امر کے لیے راضی کرنا تھا۔ ان کے بیٹوں کو ڈر تھا کہ کہیں ان کا باپ یہ بات سن کر خفا نہ ہو جائے۔ اسی سوچ میں مزید کئی دن گزر گئے۔ سیٹھ قاسم علی کی ایک عادت اور بھی تھی کہ ایک بار فیصلہ کرنے کے بعد، وہ پیچھے نہیں ہٹتے تھے۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے، وہ نفع و نقصان سے بے پرواہ ہو کر، اپنی بات پہ ڈٹ جاتے تھے اور غصے کے بھی بہت تیز تھے۔ اسی لیے ان کے بیوی بچے اور ملنے ملانے والے سب لوگ ان سے بات کرتے ہوئے ڈرتے تھے اور ان سے ایک فاصلہ رکھ کر ہی ملتے جلتے تھے۔

سیٹھ قاسم علی ملک کے معروف صنعت کار تھے۔ دولت ان کے گھر کی باندی تھی۔ ان کے بچے مشہور اور مہنگے تعلیمی اداروں میں پڑھتے آئے تھے اور آج کسی قابل ہو کر باپ کے بزنس کو آگے بڑھا رہے تھے۔

سیٹھ قاسم علی کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ بیٹیاں شادی کے بعد اپنے اپنے گھروں میں خوش اور آباد تھیں۔ تینوں بیٹے بھی شادی شدہ اور اپنی زندگی میں خوش و مطمئن تھے۔

سیٹھ قاسم علی ساٹھ سال کے تھے مگر ابھی بھی بہت چاک و چوبند اور تندرست تھے۔ پچھلے کچھ عرصے سے وہ کافی پریشان اور الجھے الجھے سے رہتے تھے۔ انہیں لگتا تھا کہ جیسے وہ عجیب و غریب ”بیماری“ کا شکار ہو چکے ہیں جس کا علاج دنیا کے کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں تھا۔ دنیا کو مٹھی میں کر لینے کا دعویٰ کرنے والے سیٹھ قاسم علی ایک ”بیماری“ سے ہارنے لگے تھے۔ اپنے مصروف شیڈول میں سے وقت نکال کر وہ اب اکثر مختلف اور نامور ڈاکٹرز کا وزٹ کرنے لگے تھے۔ مزے کی بات یہ تھی کہ ان کی تمام رپورٹس اور ٹیسٹ کلیئر

کو آرام پہنچانا تھا۔“

”پتا نہیں..... ہمارے یہاں یہ غلط سوچ کیوں اتنی صدیوں سے پروان چڑھ رہی ہے کہ ذرا والدین بڑھاپے کی دہلیز پر پہنچے نہیں، انہیں فالتو سامان کی طرح گھر کے کسی کونے میں رکھ دیا جاتا ہے یا مقدس چیزوں کی طرح ایک کونے میں سجا کر کبھی کبھی ان کی زیارت کرنا اولاد کے سارے فرائض کو پورا کر دیتا ہے؟“

”نہیں، میرے بچو! اس عمر میں تو ماں باپ کو زیادہ ضرورت ہوتی ہے اپنے بچوں کی۔ کام کرنا، خود کو ہمیشہ مصروف رکھنا ہی تندرست اور صحت مند جسم و ذہن کی بقا کے لیے ضروری ہے۔ رکا ہوا پانی ہو یا انسانی وجود انہیں بہت جلد کائی لگ جاتی ہے۔“

”خیر.....“ سیٹھ قاسم علی نے اپنی بات کو سمیٹتے ہوئے اپنے تینوں بیٹوں پہ نگاہ ڈالی۔

”میں کچھ دنوں کے لیے اپنے آبائی گاؤں جا رہا ہوں، وہاں یہ کچھ کام کافی عرصے سے pending پڑا ہوا ہے۔ اسے بھی اب نمٹا ہی لوں۔ تم تینوں یہاں سب سنبھال لینا۔ کوئی مسئلہ ہو تو مجھے اطلاع کر دینا۔“

سیٹھ قاسم علی نے کاروباری لہجے میں، اپنے بیٹوں کو ہدایات دیتے ہوئے کہا۔ تو تینوں سر ہلاتے ہوئے غور سے ان کی سب ہدایات سننے لگے۔

اگلی صبح سیٹھ قاسم علی اپنے مشیر خاص بشیر احمد کے ساتھ اپنے گاؤں کی طرف روانہ ہوئے۔ پچھلے کافی عرصے سے وہ گاؤں میں ایک اسپتال، بنانے کا سوچ رہے تھے۔ اس کے لیے ایک بہت بڑا رقبہ مختص کر چکے تھے۔ اب فائنلی اس کا وزٹ کر کے آگے کا کام شروع کرنا چاہ رہے تھے۔

شروع کے تین دن تو اسی بھاگ دوڑ اور لوگوں سے ملنے ملانے میں گزر گئے۔ گاؤں میں پہلے کی نسبت صورت حال بہتر ضرور تھی مگر تعلیم اور صحت جیسے بنیادی مسئلے جوں کے توں تھے۔

یہاں آکر سیٹھ قاسم علی کا ارادہ ایک اسکول بنانے کا بھی بن گیا اور سیٹھ قاسم علی نے بشیر احمد کو اس کے لیے بھی ہدایات دے دیں۔ اس شام اسکول کے لیے زمین پسند کر کے وہ واپس حویلی کی

ایک دن ڈرتے ڈرتے تینوں بیٹوں نے باپ کو شہر کے مشہور ماہر نفسیات سے ملنے کا مشورہ دے دیا۔ ان کی بات سن کر سیٹھ قاسم علی قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ تینوں بیٹوں نے حیرانی سے باپ کو ہنستے ہوئے دیکھا۔

”میرے بچو مجھے خوشی ہے کہ تم لوگوں نے میرے بارے میں سوچا، فکر مند ہوئے مگر تمہیں کیا لگتا ہے کہ میں نے اس بارے میں کچھ نہیں سوچا ہوگا؟“

سیٹھ قاسم علی نے اپنے تینوں بیٹوں پہ نظر ڈالی جو حیرانی سے باپ کو دیکھ رہے تھے۔

”تو اس کا مطلب ہے کہ آپ.....“ بڑے بیٹے فرخ نے کچھ سوچتے ہوئے بات ادھوری چھوڑی۔

”ہاں..... میں ملک کے کئی ماہر نفسیات کو بھی دکھا چکا ہوں۔ کسی نے اسے میرا وہم، کسی نے ذہنی اختراع اور نجانے کون کون سی بیماریاں گنوا دیں مگر.....“ سیٹھ قاسم علی نے گہری سانس لی۔

”مگر کیا پاپا.....“ دوسرے نمبر والے بیٹے ولید نے باپ کو رکتے دیکھ کر بے چینی سے پوچھا۔

”گھر میں کوئی بھی مجھے اس بیماری سے نجات نہیں دلا سکا۔ نہ وقتی طور پر اور نہ مستقل طور پر۔ نجانے کیوں لوگوں کے پاس رائے تو بہت سی ہوتی ہیں، مگر کسی بھی مسئلے کا حل نہیں ہوتا۔ باتیں وقتی طور پر آپ کو تسلی ضرور دے دیتی ہیں مگر بعض اوقات باتوں سے زیادہ عمل کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ آریا پار کا فیصلہ ہو سکے۔ یہ درمیانی کیفیت بہت تکلیف دہ ہوتی ہے۔“

سیٹھ قاسم علی نے گہری سانس لیتے ہوئے افسردگی سے کہا۔

”پاپا.....! مجھے لگتا ہے کہ اب آپ تھک گئے ہیں۔ آپ کچھ وقت کے لیے یا مکمل طور پر آرام کیوں نہیں کرتے۔ ہم لوگ ہیں ناں آپ کی ذمہ داریاں اٹھانے کے لیے۔“

سب سے چھوٹے بیٹے ذیشان نے باپ کو تھکا تھکا اور افسردہ دیکھ کر بے ساختہ کہا تو سیٹھ قاسم علی نے سنجیدگی سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

”سوری..... اگر آپ کو برا لگا ہے تو..... میرا مقصد صرف آپ



طرف جا رہے تھے کہ مغرب کی اذان کا وقت ہو گیا۔ گاؤں کی مسجد سے ”اللہ اکبر“ کی صدا ہر دل پہ اثر کر رہی تھی۔ سیٹھ قاسم علی نے بھی ڈرائیور کو گاڑی روکنے کے لیے کہا اور بشیر احمد کے ساتھ نماز پڑھنے مسجد میں داخل ہو گئے۔

”ان سے ملیں، یہ اس مسجد کے امام مولوی عثمان فاروقی ہیں۔“ نماز کے بعد بشیر احمد نے ایک شخص کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ سیٹھ قاسم علی نے سر ہلاتے ہوئے

مولوی عثمان فاروقی کی طرف دیکھا۔ سادہ سے حلیے میں ملبوس، سفید ڈاڑھی چہرے پر پُر شفقت مسکراہٹ۔ مولوی عثمان فاروقی کی عمر بھی ساٹھ کے لگ بھگ ہی تھی۔

وہ لوگ ابھی باتیں کر رہے تھے کہ اسی وقت ایک نوجوان جس کے چہرے اور آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی اور انداز بہت مؤدبانہ تھا، مسجد میں داخل ہوا اور ان کے پاس آ کر دھیرے سے سلام کیا۔

”یہ میرا بیٹا ہے، ڈاکٹر علی فاروقی.....!“

مولوی صاحب نے بہت محبت اور فخر سے اپنے بیٹے کا تعارف کرواتے ہوئے کہا تو سیٹھ قاسم علی نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔ مولوی عثمان فاروقی بہت محبت اور فخر کے ساتھ اپنے بیٹے کی ذہانت اور قابلیت کا ذکر کر رہے تھے۔ سیٹھ قاسم علی طنزیہ مسکرائے۔ ہر والدین کی طرح انہیں بھی اپنا بیٹا دنیا کا سب سے ذہین اور قابل بچہ لگتا ہے۔ اچانک انہیں کچھ سوچا اور انہوں نے ازراہ مذاق ڈاکٹر علی فاروقی کی طرف دیکھ کر کہا۔

”مولوی عثمان فاروقی! ہم آپ کے بیٹے کی قابلیت کو تب

مانیں گے جب آپ کا بیٹا، میری بیماری کا علاج کر لے گا۔“

”آپ کو کیا بیماری ہو سکتی ہے۔ آپ تو ماشاء اللہ تندرست نظر آتے ہیں۔“ مولوی عثمان فاروقی نے الجھتے ہوئے کہا۔

”مولوی صاحب! ظاہر اکثر ہمیں دھوکا دیتا ہے۔“

”تم بتاؤ جوان، کرو گے میرا علاج؟“

سیٹھ قاسم علی نے براہ راست علی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”انشاء اللہ! ضرور سر.....“ ڈاکٹر علی فاروقی نے اعتماد کے ساتھ کہا تو سیٹھ قاسم علی کچھ دیر تک اس کے پُر اعتماد چہرے اور آنکھوں کی ذہانت کو دیکھتے رہے۔

”مجھے اچھا لگا تمہارا اعتماد مگر میں جانتا ہوں کہ جب دنیا کے بڑے بڑے ڈاکٹر میرا علاج نہ کر سکے تو تم تو ابھی طفل مکتب ہو۔ خیر اچھا لگا آپ لوگوں سے مل کر۔ اب میں چلتا ہوں۔“

سیٹھ قاسم علی نے دونوں سے ہاتھ ملایا اور بشیر احمد کے ساتھ مسجد سے باہر نکلنے لگے۔

”میں اب بھی اپنی بات اور دعوے پر قائم ہوں۔ سیٹھ صاحب! کبھی کسی چیز کو چھوٹا اور معمولی سمجھ کر نظر انداز نہیں کرنا

شدت سے اس کا احساس ہونے لگا ہے اور مجھے لگتا ہے کہ میں اندر سے بالکل خالی ہوں۔ تم جانتے ہو، مجھے کیا بیماری ہے؟“

سیٹھ قاسم نے توجہ سے سنتے ڈاکٹر علی فاروقی کی طرف دیکھ کر کہا۔ تو اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”مجھے رشتوں کو توڑ دینے کی، انہیں چھوڑ دینے کی بیماری ہے۔ پہلے یہ عادت تھی جو دھیرے دھیرے بیماری کی صورت اختیار کر گئی ہے۔“

سیٹھ قاسم نے کہا تو ڈاکٹر علی فاروقی نے ان کی بات پہ چونکتے ہوئے انہیں دیکھا۔

”ہاں! تم بھی سمجھ رہے ہو گے کہ یہ کیسی بیماری ہے۔ ضرور یہ بڑھا پاگل ہو گیا ہے۔“ سیٹھ قاسم نے ڈاکٹر علی کو چونکتے دیکھ کر خود کلامی کرتے ہوئے کہا۔

”مگر اس بیماری کی تکلیف کیا ہوتی ہے اذیت کیا ہے اور یہ وہ ہی شخص بتا سکتا ہے جو اس بیماری کا شکار ہو۔“

تم جانتے ہو جیسے جیسے میں بڑھاپے کی طرف بڑھتا جا رہا ہوں مجھے بہت شدت سے اپنے تمام چھوڑے اور توڑے گئے رشتے یاد آتے ہیں۔ میں کتنی آسانی اور آرام سے کسی سے بھی قطع تعلق کر لیتا تھا اور مجھے احساس تک نہیں ہوتا تھا کہ میں کیا گنوا رہا ہوں۔ سکون اور ادویات بھی مجھ پہ اثر نہیں کرتی ہے اور میں روز بروز اپنی بیماری کے ہاتھوں ہارتا جا رہا ہوں۔ میرے اندر کا خالی پن، سناٹے میں تبدیل ہو چکا ہے جہاں صرف گونج باقی رہ گئی ہے، پچھتاؤں کی۔ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ میرے ساتھ!!!“

سیٹھ قاسم نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔ ڈاکٹر علی فاروقی نے پانی کا گلاس ان کی طرف بڑھایا جسے سیٹھ قاسم نے دھیرے سے اٹھا کر لبوں سے لگا لیا۔

”آپ جسمانی یا ذہنی بیماری کا شکار نہیں ہیں۔ اسی لیے آج تک کوئی آپ کی بیماری کا علاج نہیں کر سکا۔“

ڈاکٹر علی فاروقی نے دھیرے دھیرے بولنا شروع کیا۔

”اور جب تک بیماری کی صحیح تشخیص نہ ہو اس کا علاج بھی ممکن نہیں ہوتا۔ چاہے کوئی کتنا ہی قابل ڈاکٹر کیوں نہ ہو۔“

چاہیے۔ اکثر ہمارے مسئلوں کا حل انہی میں چھپا ہوتا ہے۔“

ڈاکٹر علی نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں سیٹھ قاسم علی کی پشت کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ڈاکٹر علی کی آواز پہ سیٹھ قاسم نے مڑ کر اسے دیکھا۔

”میں آپ کا انتظار کروں گا اور مجھے امید ہے کہ آپ ضرور آئیں گے۔“ ڈاکٹر علی فاروقی نے یقین بھرے لہجے میں کہا تو سیٹھ قاسم نے مسکرا کر اسے دیکھا اور مسجد سے باہر نکل گئے۔

مگر اگلی صبح بشیر احمد کی حیرانی کی کوئی حد نہ رہی جب سیٹھ قاسم نے ڈاکٹر علی فاروقی کے کلینک پہ چلنے کو کہا۔

”مگر سر وہ.....“ بشیر احمد نے کچھ کہنا چاہا مگر سیٹھ قاسم نے ہاتھ سے روک دیا۔ بشیر احمد نے سمجھتے ہوئے سر ہلایا اور ڈرائیور کو مولوی عثمان فاروقی کے گھر چلنے کو کہا کیوں کہ گھر کے ساتھ ہی بنے چھوٹے سے کلینک میں ڈاکٹر علی فاروقی مریضوں کو چیک کرتے تھے۔

سیٹھ قاسم نے چھوٹے سے کلینک کو بہت غور سے دیکھا جس میں بمشکل تین کمرے تھے۔ اس وقت کوئی مریض موجود نہیں تھا۔

”آئیے سیٹھ قاسم میں آپ کا ہی انتظار کر رہا تھا۔“ ڈاکٹر علی فاروقی نے مسکراتے ہوئے سیٹھ قاسم کو بیٹھنے کے لیے کہا۔

”کافی پُر اعتماد ہو تم..... اچھا لگا تمہارا یہ انداز۔“ سیٹھ قاسم نے سگار سلگاتے ہوئے کہا۔

”میں نے بڑے بڑے ڈاکٹرز کو دکھایا ہے حتیٰ کہ ماہر نفسیات کو بھی مگر کوئی بھی مجھے اس عجیب و غریب بیماری سے نجات نہیں دلا سکا ہے۔“

سیٹھ قاسم نے اپنے مسئلے کی طرف آتے ہوئے کہا۔

”جی آپ بولیں میں سن رہا ہوں۔“ سیٹھ قاسم کو خاموش ہوتے دیکھ کر ڈاکٹر علی فاروقی نے کہا۔

”سننے میں کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ شاید تم بھی مجھے ذہنی مریض سمجھو یا اسے میرا وہم کہو مگر.....!!“ سیٹھ قاسم نے گہری سانس لی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مجھے بہت شدت سے احساس ہوتا

ہے کہ میری بیماری بڑھتی جا رہی ہے۔ جب میں جوان تھا، اس وقت

اس بات کا اتنا احساس نہیں ہوتا تھا اور اگر ہوتا بھی تھا تو زندگی کی گہما گہمی میں کھو کر بھول جاتا تھا مگر اب پچھلے کچھ سالوں سے بہت

• سیٹھ قاسم آپ دراصل روحانی بیماری کا شکار ہیں اور آپ شکر کریں کہ آپ کو اپنے خالی پن اور بیماری کا احساس ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ کا دل ابھی زندہ ہے، ورنہ وہ بھی لوگ ہیں جنہیں کبھی اس چیز کا احساس تک نہیں ہوتا کیوں کہ ان کے دلوں پہ مہر لگ چکی ہوتی ہے۔“

”روحانی بیماری.....!!!“ سیٹھ قاسم علی نے چونک کر ڈاکٹر علی فاروقی کی طرف دیکھا۔

”ہاں! روحانی بیماری.....“ ڈاکٹر علی فاروقی نے سنجیدگی سے سر ہلایا۔

”اپنی ضد، غصے اور انا کی وجہ سے ہم بہت سے رشتوں کو کھو دیتے ہیں اور ایسا ہی آپ کے ساتھ ہوا۔ آپ کے اندر کا خالی پن بھی اسی لیے ہے کہ آپ نے رشتوں کو جوڑنے کے بجائے، توڑنے کا کام کیا۔ صلہ رحمی، درگزر، برداشت، معافی اور صبر کے بجائے ضد، غصہ اور انتقام سے کام لیا۔

آپ جانتے ہیں کہ قرآن پاک میں جگہ جگہ صلہ رحمی، معافی اور درگزر کا حکم دیا گیا ہے۔ کہیں بھی رشتوں کو توڑنے کا یا چھوڑنے کا ذکر نہیں ہے!!! آپ نے اپنی بیماری کے لیے سب سے رجوع کیا۔ کیا کبھی اس کی ذات سے رجوع کیا؟ کیا آپ نے کبھی اس کے احکامات کو سمجھا؟

خیر میں آپ کا زیادہ ٹائم نہیں لوں گا۔ میرے پاس آپ کی بیماری کا بہت آسان اور مکمل حل موجود ہے مگر شرط یہ ہے کہ آپ دل سے کوشش کیجیے گا۔“

”یہ لیجیے.....!!!“ ڈاکٹر علی فاروقی نے، سائیڈ پہ بنے بک شیلف میں سے ایک کتاب نکال کر سیٹھ قاسم کی طرف بڑھائی جسے انہوں نے تھام لیا۔

”سیرۃ النبی ﷺ.....“

سیٹھ قاسم نے زیر لب کتاب کا ٹائٹل پڑھا اور حیرت انگیز نظروں سے ڈاکٹر علی کی طرف دیکھا جو مسکراتے ہوئے انہیں دیکھ رہا تھا۔

”جی سیٹھ صاحب! ہمارے پیارے نبی حضرت محمدؐ کی حیات مبارکہ ہمارے لیے علم و راہنمائی کا ایسا سورج ہے کہ ہمیں کسی بھی

طرح اندھیروں کا کوئی ڈر یا خوف نہیں ہے۔ آپ شمع ازل ہیں۔ ہمارے پیارے نبیؐ اپنوں کے ساتھ ساتھ، دشمنوں پر بھی بہت مہربان تھے۔ آپ یقین کریں اس کتاب کو ختم کرتے کرتے، آپ اپنی ہر طرح کی ذہنی اور روحانی بیماریوں سے نجات پالیں گے۔ آپ کی ذات رحمتِ دو عالم ہے اور ان کی رحمت کے سائے تلے کوئی بھی محروم نہیں رہتا ہے اور یہی میرا ایمان بھی ہے۔ یقین بھی.....“ ڈاکٹر علی نے مسکراتے ہوئے نم آنکھوں سے کہا۔

سیٹھ قاسم علی نے اپنی پُر نم آنکھوں کو دھیرے سے انگلی کی پوروں صاف کیا اور ڈاکٹر علی فاروقی سے گلے ملتے ہوئے کلینک سے نکل گئے۔

ڈاکٹر علی فاروقی مطمئن ہو کر کلینک میں آئے اور مریضوں کو دیکھنے لگے جب کہ سیٹھ قاسم سینے سے کتاب لگائے واپسی کا سفر کرتے ہوئے گہری سوچ میں گم تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اب ان کی بیماری کا نام و نشان مٹنے والا ہے کیوں کہ آپ کا نام ہی اتنا بابرکت ہے کہ دل روشن ہو جاتا ہے۔ آپ کی سیرت طیبہ پر عمل کرنے سے زندگی تو زندگی، آخرت تک سنور جاتی ہے۔☆☆

”سوال یہ ہے کہ.....!“ میں انعام پانے والوں کے نام

1۔ محمد ارسلان، چکوال 2۔ شکیلہ اصغر، لاہور 3۔ عائشہ صدیقہ، چکوال

”سوال یہ ہے کہ.....!“ میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام:

ارتج علی، لاہور۔ محمد گوہر مصطفیٰ، رحیم یار خان۔ مجیب الرحمن،

دہاڑی۔ محمد مجیر خان، بھکر۔ فاروق احمد خان، خوشاب۔ فاطمہ الزہرہ، ڈیرہ

اسماعیل خان۔ علیہ عامر، فیصل آباد۔ ردا شاہد، شیخوپورہ۔ عائشہ حریم،

کوہاٹ۔ رانا بلال احمد، بھکر۔ نوریہ سلیمانی، کراچی۔ محمد ارسلان ملتانی،

گوجرانوالہ۔ عائشہ کریم، ملتان۔ ردا فاطمہ، ستیانہ بنگلہ۔ جواد الحسن، مسر

وقار، لاہور۔ فاطمہ عمران، اسلام آباد۔ صالحہ اظہر، ٹیکسلا۔ ردا فاطمہ فریال،

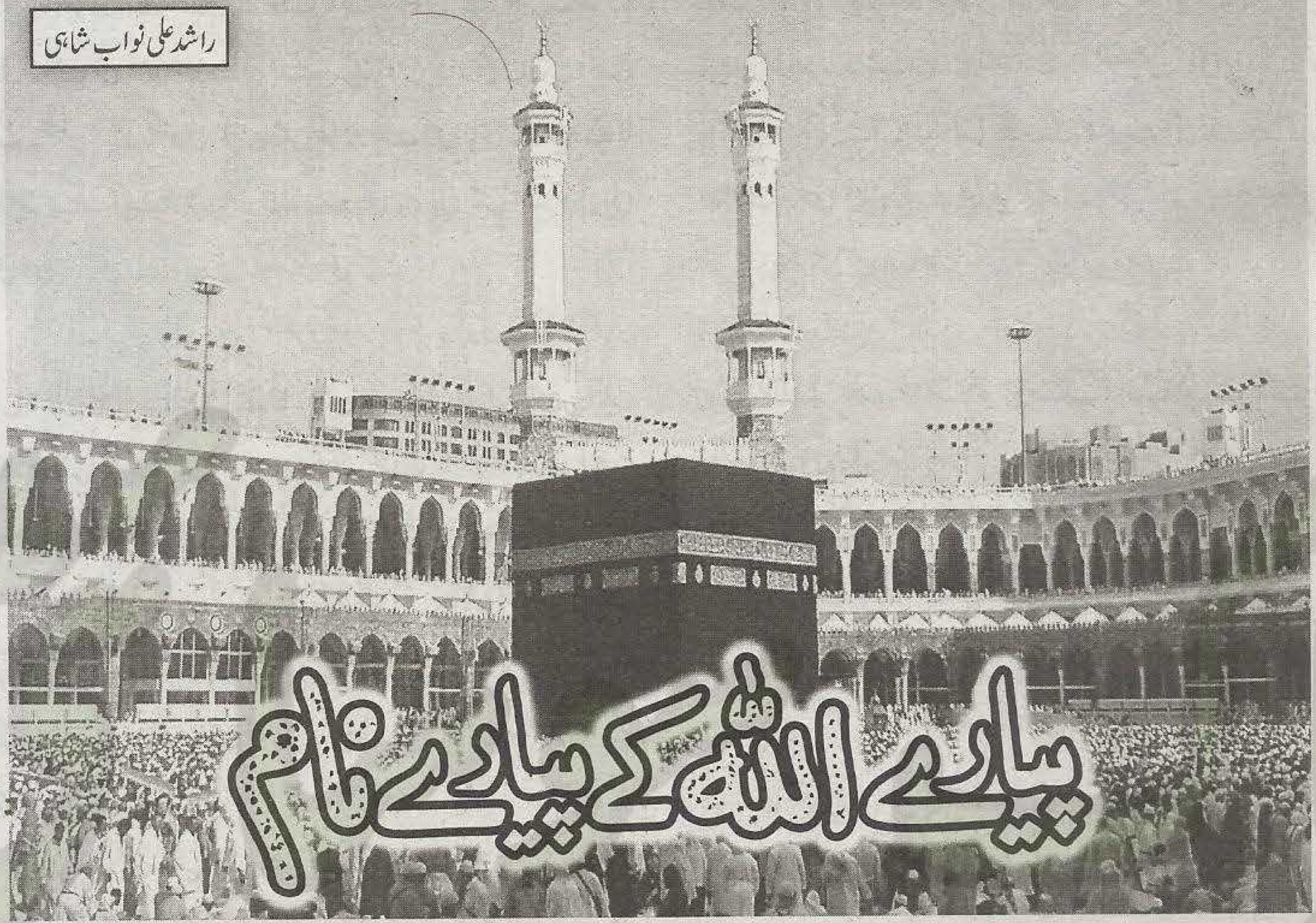
امامہ عالم، انصی سجاد، راول پنڈی۔ مریم صدیقہ، ولید احمد سید، گوجرانوالہ۔

حاجرہ جاوید، راول پنڈی۔ سلمان علی اعوان، واہ کینٹ۔ علشہ رضوان،

ملتان۔ عائشہ مجید، لاہور۔ عشاء سعید، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ ایمان نواب، راول

پنڈی۔ محمد ثر صدیق، کراچی۔ محمد احمد خان غوری، بہاول پور۔☆☆

راشد علی نواب شاہی



پیارے اللہ کے پیارے نام

کی امید رکھی جائے۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک بہت پیاری حدیث نقل فرمائی جس کا مفہوم یہ ہے کہ: ”السَّلَامُ“ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام ہے جسے اللہ تعالیٰ نے زمین پر اتارا ہے۔ لہذا اس کو آپس میں خوب پھیلاؤ، کیوں کہ مسلمان جب کسی قوم پر گزرتا ہے اور ان کو سلام کرتا ہے اور وہ اس کو جواب دیتے ہیں تو ان کو سلام یاد دلانے کی وجہ سے سلام کرنے والے کو اس قوم پر ایک درجہ فضیلت حاصل ہوتی ہے اور اگر وہ جواب نہیں دیتے تو فرشتے جو انسانوں سے بہتر ہیں، اس کے سلام کا جواب دیتے ہیں۔

شکاری، باز اور بلبل

بلبل سخت پریشان تھا۔ باز مسلسل اس کے تعاقب میں تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اچانک باز، بلبل پر جھپٹا لیکن بلبل ایک بار پھر بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ بلبل نے قریب ہی ایک درخت کی چھوٹی سی شاخ پر پناہ لے لی۔ بلبل، باز کو مسلسل

الرَّحْمَنُ جَلَّ جَلَالُهُ (بے حد رحم کرنے والا)

الرَّحْمَنُ جَلَّ جَلَالُهُ وہ ہے کہ جب اس سے مانگا جائے تو خوش ہو اور عطا کرے۔

اللہ تعالیٰ نے جب رحمت کو بنایا تو اس کے 100 حصے کیے۔ ان میں سے ایک رحمت اللہ تعالیٰ نے دُنیا میں اتاری ہے۔ اس رحمت کی وجہ سے دُنیا میں ماں باپ اپنے بچوں سے، بچے اپنی امی ابو سے، وحشی جانور اور درندے اپنے اپنے بچوں سے محبت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے 99 رحمتوں کو قیامت کے دن کے لیے رکھا ہے۔ ان 99 رحمتوں کو اس دُنیا کی رحمت سے ملا کر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر رحم فرمائیں گے۔

اللہ تعالیٰ کے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے: ”جو زمین پر رہنے والے انسانوں اور جانوروں پر رحم کرے گا تو آسمان والا اس پر رحم فرمائے گا۔“

السَّلَامُ جَلَّ جَلَالُهُ (سلامتی والا)

السَّلَامُ جَلَّ جَلَالُهُ وہ ذات ہے جس سے حفاظت و عافیت

راستہ دکھا دیا گیا۔ اور شیطان تجھ سے دُور ہو گیا ہے۔ اور ایک شیطان دوسرے شیطان سے کہتا ہے: ”تو اس آدمی پر کیسے غلبہ حاصل کر سکتا ہے؟ جب کہ اسے ہدایت دے دی گئی اور اس کی حفاظت کر دی گئی اور اسے بچا لیا گیا ہے۔“

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرض نماز کے بعد یہ دُعا بھی مانگا کرتے تھے۔

”اللَّهُمَّ أَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ تَبَارَكْتَ يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ“

ترجمہ: اے اللہ! تو ہی سلامتی والا ہے اور تیری ہی جانب سے سلامتی ہے۔ تو برکت والا ہے، اے بزرگی اور عزت والے۔

یاد رکھنے کی باتیں

○ السَّلَامُ جَلَّ جَلَالُهُ کے نام سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ سلام کو پھیلائیں۔

اپنے دوستوں، اساتذہ اور اپنے بڑوں کو سلام کرنے میں پہل کریں۔

○ اور جب اسکول سے پڑھ کر گھر آئیں تو امی، بہن بھائی کو سلام کریں۔

○ اللہ تعالیٰ سلامتی دینے والا ہے اس نے دو موتوں کے درمیان بلبل کو سلامتی عطا فرمائی۔ ایک طرف باز تھا تو دوسری شکاری، مگر جب السَّلَامُ جَلَّ جَلَالُهُ حفاظت کرتا ہے اور سلامتی دیتا ہے تو موت کا بڑے سے بڑا ذریعہ بھی کسی سے زندگی نہیں چھین سکتا۔ اس لیے ہم بھی صرف اللہ تعالیٰ سے سلامتی مانگیں۔

○ جب بھی ہم گھر سے نکلیں تو یہ دُعا ”بِسْمِ اللَّهِ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللَّهِ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ“ ضرور پڑھ لیں تاکہ ہم اللہ تعالیٰ کی سلامتی میں آجائیں۔

○ ہر فرض نماز کے بعد ”اللَّهُمَّ أَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ تَبَارَكْتَ يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ“ والی دُعا بھی مانگنے کا معمول بنانا چاہیے۔ ☆☆☆

دیکھ رہا تھا جو اسے کب سے خوف ناک آنکھوں سے گھورے جا رہا تھا کہ جیسے ہی بلبل اڑے وہ اسے اپنے خون خوار پنجوں میں دبوچ لے۔ بلبل ایسے جگنو کی تلاش میں تھا جو اسے اس باز سے بچانے کا ذریعہ بنے۔ ایک مرتبہ جگنو نے رات کی تاریکی میں اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی روشنی سے اس کی راہ نمائی کی تھی۔

”اف یہ کیا!!!“ دوسرا منظر دیکھ کر وہ مزید خوف زدہ ہو گیا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ بلبل کیا دیکھتا ہے کہ زمین پر ایک شکاری اس کا نشانہ لے رہا ہے۔ ایک طرف باز اور دوسری طرف بندوق لیے ہوئے شکاری۔

دونوں طرف اس کی موت انتظار میں تھی۔ بلبل اڑتا تو باز اس کے تعاقب میں ہے، وہ بلبل پر جھپٹنے کے لیے خوف ناک پنچے تیار کیے بیٹھا ہے اور اگر اسی شاخ پر بیٹھا رہتا ہے تو وہ شکاری کے نشانے کی زد پر تھا۔

اس صورت حال میں دو موتوں کے درمیان بلبل نے ”السَّلَامُ جَلَّ جَلَالُهُ“ دُعا مانگی جو سلامتی دینے والا اور حفاظت کرنے والا ہے۔ شکاری، بلبل کا نشانہ لے کر لہلی دبانے ہی والا تھا کہ زمین میں بنے ہوئے ایک سوراخ سے بچھو نکلا، اس نے شکاری کے پاؤں پر زور دار ڈنک مارا۔ شکاری کا نشانہ چونک گیا اور وہ نشانہ باز کو جا لگا۔ باز اور شکاری دونوں ڈھیر ہو گئے اور السَّلَامُ جَلَّ جَلَالُهُ نے دو موتوں کے درمیان بلبل کی مکمل حفاظت فرمائی۔

گھر سے نکلتے وقت

انسان جب بھی گھر سے باہر جائے تو یہ دُعا پڑھ لینے سے اللہ تعالیٰ کی سلامتی میں آجاتا ہے۔

”بِسْمِ اللَّهِ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللَّهِ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ“

ترجمہ: میں اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ گھر سے نکلتا ہوں۔ اسی پر بھروسہ کرتا ہوں۔ نہ برائی سے بچ سکتا ہوں اور نہ نیکی کر سکتا ہوں لیکن صرف اللہ تعالیٰ کی توفیق کے ساتھ۔

یہ دُعا پڑھ لینے سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ خوش خبری ملتی ہے کہ یہ دُعا تیرے لیے کافی ہے، تجھے بچا لیا گیا اور تجھے سیدھا



اندھیرنگری چوٹ لاج

جوں توں کر کے گزر بسر کرتا ہوں۔ گزشتہ رات میں نے ایک مکان میں نقب کیا لگائی کہ دیوار ہی مجھ پر آن گری میں نے بچنے کی بہت کوشش کی لیکن میری ایک ٹانگ بلے کے نیچے دب کر ٹوٹ گئی ہے، اب میں معذور ہو گیا ہوں۔ آپ ذرا مالک مکان سے پوچھیں کہ اس نے ایسی ناقص اور کمزور دیوار کیوں بنوائی تھی؟“ بادشاہ نے چور کی فریاد توجہ سے سنی اور حکم دیا کہ مالک مکان کو ہمارے حضور پیش کیا جائے۔ غلاموں نے حکم کی تعمیل کی اور مالک مکان کو پکڑ کر لے آئے۔ بادشاہ نے اس سے پوچھا: ”تم نے اپنے مکان کی دیوار ناقص کیوں بنوائی تھی؟ ذرا دیکھو تو سہی کہ اس کے گرنے سے ہمارا ایک ہنرمند شہری معذور ہو گیا ہے۔“ مالک مکان نے ہاتھ جوڑ کر بڑے ادب سے کہا: ”حضور جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں۔“ ”کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔“ ”میرے آقا! دیوار میں نے نہیں بنائی بلکہ معمار نے بنائی تھی لہذا قصور اس کا ہے میرا نہیں۔“ بادشاہ نے معمار کو بلوایا اور اس سے پوچھا: ”اے تو نے اتنی کمزور دیوار کیوں بنائی تھی جو نقب برداشت نہ کر سکی اور دھڑام سے ایک انسان پر آگری؟“ معمار نے جواب دیا: ”حضور جس دن میں نے یہ دیوار بنائی تھی اس دن مزدور نے گارا ناقص بنایا تھا لہذا قصور مزدور کا ہے میرا نہیں۔“ بادشاہ نے مزدور کو بلا کر پوچھا: ”ارے ناہجار! تو نے ناقص گارا کیوں بنایا تھا؟“ مزدور نے اپنی صفائی دیتے ہوئے کہا: ”جناب! جب میں گارا بنا رہا تھا تو اس وقت آپ کے وزیر اعظم صاحب اپنی ہاتھی پر سوار وہاں سے گزر رہے تھے۔ ہاتھی مست تھا۔ مجھے ڈر محسوس

پرانے وقتوں کی بات ہے کہ بغداد میں ایک شیخ اور اس کا ایک مرید اکٹھے رہتے تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے کسی دوسرے شہر کی طرف سفر کیا۔ جب وہ اپنی منزل مقصود پر پہنچے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہاں کھانے پینے کی اشیاء ایک روپے فی کلو کے حساب سے فروخت ہوتی تھیں۔ اس قدر سستی اشیاء کو دیکھ کر مرید کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اس نے اپنے شیخ سے عرض کی: ”حضور! اس شہر میں اپنے قیام کی مدت بڑھا لیجئے تاکہ ہم یہاں کی نعمتوں سے لطف اندوز ہو سکیں۔“ شیخ نے اسے نصیحت کرتے ہوئے کہا: ”چونکہ یہاں تمام اشیاء کا ایک ہی بھاؤ ہے، لہذا مجھے یہاں خطرے کی بو محسوس ہو رہی ہے۔ ہم یہاں زیادہ دن نہیں ٹھہر سکتے۔“ مرید موٹی عقل رکھتا تھا۔ وہ اپنے استاد کی بات نہ سمجھ سکا اور لگا اصرار کرنے کہ نہیں آقا! یہاں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ قصہ مختصر اس نے منت سماجت کر کے اپنے مرشد سے بات منوالی اور اس شہر میں رہنے لگے۔

ایک دن استاد اور شاگرد سیر کرتے کرتے بادشاہ کے دربار میں جا پہنچے۔ بادشاہ نے اس دن کھلی کچہری لگائی ہوئی تھی۔ لوگ اپنے اپنے مسائل بیان کر رہے تھے اور حاکم وقت اسی وقت فیصلے صادر کر رہا تھا۔ شیخ اور مرید بھی لوگوں کے ہجوم میں شامل ہو گئے اور ”عدل و انصاف“ کی کارروائی کو بڑی دلچسپی سے دیکھنے اور سننے لگے۔ اسی اثناء میں ایک نامی گرامی چور لنگڑاتا ہوا آیا اور بادشاہ کے سامنے لیٹ گیا۔ اس نے اپنی رام کہانی کچھ یوں سنائی: ”بادشاہ سلامت! میں ایک عام سا آدمی ہوں، چوری میرا پیشہ ہے۔ اسی کے سہارے میں

ہوا کہ کہیں مجھے کچل نہ دے، لہذا میں نے گارے میں بہت سا پانی انڈیلا اور اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ کھڑا ہوا۔ اس افراتفری میں گارا ناقص بنا۔ لہذا قصور آپ کے وزیراعظم کا ہے نہ کہ میرا۔ بادشاہ نے اپنے وزیراعظم سے پوچھا کہ اس نے اس دن ایک مست ہاتھی پر سواری کیوں کی تھی؟ وزیراعظم نے جواب دیا: ”جہاں پناہ! میرا ہاتھی مست نہیں تھا، بلکہ وہاں ایک عورت زیورات سے لدی پھندی اچانک اس کے سامنے آگئی تھی۔ زیوروں کی جھنکار سن کر ہاتھی ایسا بدکا کہ قابو سے باہر ہو گیا، لہذا قصور میرے ہاتھی کا نہیں بلکہ اس عورت کا ہے۔ جس نے بجتے ہوئے زیور پہن رکھے تھے۔“ بادشاہ نے عورت کو حاضر کرنے کا حکم جاری کیا۔ جب عورت دربار میں آئی تو بادشاہ نے اس سے پوچھا: ”اری نیک بخت! تو بجتے والے زیور کیوں پہنتی ہے؟ ذرا دیکھ تو سہی تیرے زیوروں کی جھنکار سے کس قدر نقصان ہو چکا ہے۔“ عورت نے سر جھکا کر بڑے ادب سے کہا ”زیور میں نے بنائے نہ خریدے، بلکہ میرے خاوند نے مجھے پہنائے ہیں۔ قصور وار میرا خاوند ہے نہ کہ میں۔ آپ نے مجھے دربار میں بلا کر ناحق زحمت اٹھائی ہے۔“ بادشاہ نے عورت کو رخصت کیا اور اس کے خاوند کی طلبی کا فرمان جاری کیا۔ خدام اس عورت کے خاوند کو پکڑ لائے۔ بادشاہ نے اس سے پوچھا: ”تو نے اپنی بیوی کو زیور کیوں پہنائے ہیں؟“ خاوند نے کہا: ”حضور! سارا قصور اس سنار کا ہے جس نے زیور بنائے ہیں، نہ وہ بجتے والی اشیاء بناتا نہ ہم خریدتے۔“ بادشاہ نے سنار کو طلب کر لیا اور اس سے پوچھا: ”ارے تو زیور کیوں بناتا ہے؟“ سنار نے کہا: ”یہ میرا خاندانی پیشہ ہے۔ میرے باپ دادا بھی یہی کام کرتے تھے جو میں کر رہا ہوں۔ اگر زیور نہ بناؤں تو اپنا اور اپنے اہل و عیال کا پیٹ کیسے پالوں؟“ بادشاہ نے اس کی بات قبول نہ کی بلکہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اس حادثے کا ذمہ دار یہی سنار ہے۔ اس نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا: ”سنار اپنی صفائی پیش کرنے میں ناکام ہو گیا ہے۔ اس سانحہ کے تمام پہلوؤں پر غور کر کے مابودلت اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ دیوار گرنے کا سبب اسی سنار کا پیشہ زرگری بنتا ہے، لہذا اس جرم کی پاداش میں سنار کو پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔“ خدام نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے سنار کو پکڑ کر جلا دے کے حوالے کر دیا۔ جلا دے اس کی گردن میں پھندا ڈالا۔ چونکہ اس کی گردن تپلی تھی، لہذا پھندا فٹ نہ ہوا۔ جلا دے نے شکایت کی کہ پھندا صحیح طریقے سے اپنے مقام پر نہیں بیٹھتا۔ بادشاہ نے یہ

صورت حال دیکھ کر ارشاد فرمایا: ”اس تپلی گردن والے سنار کو چھوڑ دو بلکہ اس کے بدلے اس آدمی کو پکڑ لو جس کی گردن موٹی ہو۔“ خدام نے ہجوم میں موٹی گردن والے شخص کو تلاش کرنا شروع کر دیا۔ اسی اثناء میں ان کی نظر اس مرید پر پڑی جو اس سستے شہر کی اشیاء کھا کھا کر کافی موٹا ہو چکا تھا۔ اس کی گردن بھی موٹی تھی۔ اسے بادشاہ کے سامنے لایا گیا۔ بادشاہ نے اس کی گردن کو غور سے دیکھا اور حکم جاری کیا: ”اس شخص کی گردن خاصی موٹی ہے۔ امید ہے کہ اس میں پھندا فٹ ہو جائے گا، لہذا اسے پھانسی دے دی جائے۔“ خدام اسے پکڑ کر جلا دے کی طرف لے جانے لگے تو اس نے اپنے شیخ کو بلایا اور درخواست کی کہ وہ اس نازک وقت میں اس کی مدد کرے اور سزائے موت سے بچائے۔ شیخ نے کہا: ”میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ یہاں تمام اشیاء کے نرخ یکساں ہیں اس یکسانیت کی وجہ سے کوئی نہ کوئی خطرہ درپیش ہو سکتا ہے۔ یہ بات تجھے سمجھ نہ آئی۔ جب خطرہ سامنے آ گیا تو تیری آنکھیں کھلی ہیں۔ اب پھانسی پر لٹکو اور اپنی ناسمجھی کی سزا بھگتو۔“ مرید نے گڑگڑا کر فریاد کی: ”یا شیخ! آج بھی مجھے بچا لیجئے، آئندہ میں آپ کا ہر فرمان بلا چون و چرا تسلیم کروں گا۔“ استاد کو اپنے شاگرد پر ترس آ گیا، وہ اس کے بچاؤ کی تدبیر سوچنے لگا۔ اسی اثناء میں خدام مرید کو جلا دے کے سپرد کر چکے تھے۔ جلا دے نے پھندا اس کے گلے میں ڈالا جو فٹ آ گیا۔ اب اس کے پیروں تلے سے تختہ سرکانے کی دیر تھی کہ اچانک اس کا شیخ بھاگتا ہوا پھانسی گھاٹ پر پہنچا اور جلا دے سے کہا: ”اسے چھوڑ دو اور اس کی جگہ مجھے پھانسی دے دو۔“ بادشاہ نے اس کی بات سنی اور حیرت سے پوچھا: ”اے مرد خدا! تو خود کیوں اپنی موت کو دعوت دیتا ہے؟ جس کی گردن میں پھندا فٹ بیٹھتا ہے، اسے کیوں رہائی دلواتا ہے؟“ شیخ نے کہا: ”عالم پناہ! میں اس کا مرشد ہوں۔ میں نے ابھی ابھی مراقبہ کیا ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس مبارک گھڑی میں جو شخص فوت ہوگا وہ سیدھا جنت میں جائے گا۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ میں ہی یہ سعادت حاصل کر لوں۔“ بادشاہ نے پوچھا: ”کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں؟“ ”جی حضور! سولہ آنے سچ کہہ رہا ہوں، جس میں جھوٹ اور غلطی کا شائبہ تک نہیں ہے۔“ بادشاہ نے کہا: ”ان سب کو چھوڑ دو اور مجھے پھانسی دے دو تاکہ میں جنت میں داخل ہو سکوں۔“ جلا دے نے حکم کی تعمیل کی اور بادشاہ سلامت نے پھانسی پا کر مظلوم رعایا کو اپنی نالائقی اور بدانتظامی سے نجات دلا دی۔

☆☆

کہ اپنی آواز میں مصنوعی رعب پیدا کر کے ان لوگوں کو چپ کراؤں مگر سب بے سود۔ وہ لوگ باقاعدہ میرا مذاق اڑا رہے تھے۔ میں نے غصے میں دو، تین بار ڈیسک بجایا، آواز بلند کی مگر ہر مرتبہ میری آواز شور میں دب کر رہ گئی۔ میں جلدی سے کرسی کی طرف بڑھا تاکہ بیٹھ سکوں اور جونہی میں کرسی پر بیٹھنے کے لیے جھکا، میں ایک جھٹکے سے زمین پر آن گرا۔ کرسی دانستہ طور پر اس ڈھب سے رکھی گئی تھی کہ میرا وزن پڑنے سے وہ گر جائے۔ میں جیسے ہی زمین پر گرا، ایک شور کے طوفان نے جنم لیا اور سب لڑکے کمرے سے بھاگ گئے۔



قدرت کا رجسٹر

وہ میری ملازمت کا پہلا دن تھا۔ میں زندگی میں پہلی مرتبہ اپنے آپ کو ایک کارآمد اور اہم شے محسوس کر رہا تھا۔ میری تمام تر محنت اور ریاضت کا یہ صلہ ملا تھا کہ آج میں ایک سترہویں گریڈ کا معزز لیکچرار بن گیا تھا۔ آج میں پہلی مرتبہ ایک اُمید اور طمانیت کے ساتھ بیدار ہوا تھا اور پوری تیاری کر کے گھر سے کالج کی طرف نکلا تھا۔ کالج ابھی کچھ ہی فاصلے پر تھا کہ میں نے دل ہی دل میں وہ ابتدائی تعارفی کلمات دہرانے شروع کر دیے جو مجھے آج پہلی مرتبہ کلاس لیتے ہوئے کہنے تھے۔ بہر حال میں کالج پہنچا، دیگر اساتذہ سے تعارف ہوا، حاضری لگوائی گئی اور پرنسپل صاحب سے ملنے کے بعد میں اپنی زندگی کی پہلی کلاس لینے جا رہا تھا۔

کمرہ جماعت کے باہر پہنچ کر میں نے اپنی ٹائی کی ناٹ درست کی، کچھ دعائیں پڑھیں اور کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہاں ایک طوفان بدتمیزی برپا تھا۔ جماعت کے کوئی چالیس کے قریب لڑکے اپنی کرسیوں پر کھڑے تھے اور اپنی پوری قوت سے گلا پھاڑ پھاڑ کر شور مچا رہے تھے۔ کمرے میں کاغذ کے بنے ہوائی جہازوں کا ایک پورا بیڑا ادھر سے ادھر اڑ رہا تھا۔ شور میں کئی آوازیں تھیں جو ٹوٹ ٹوٹ کر آ رہی تھیں۔ میں بھونچکا رہ گیا۔ بہتیری کوشش کی

میں جیسے ہی زمین پر گرا، میرے ذہن میں ایک چوٹ لگی۔ ایسی چوٹ جس میں مجھے بہت کچھ یاد آ گیا۔ کئی بجلیاں میرے دماغ سے ٹکرائیں۔ مجھے وہ کچھ یاد آیا جس سے میں نے اپنے آپ کو ندامت میں ڈوبنا ہوا محسوس کیا۔ میں اٹھا، کپڑے جھاڑے اور سرپٹ دوڑا۔ کالج کے گیٹ سے نکلا اور ایک ٹیکسی کو روک کر اس میں بیٹھ گیا۔ ٹیکسی والے کو میں نے مطلوبہ پتا بتایا اور جلد از جلد وہاں پہنچنے کی دعا کرنے لگا۔ مجھے ایک قرض اُتارنا تھا، بہت اہم اور بہت بڑا قرض۔ ٹیکسی اپنے رستے پر دوڑ رہی تھی اور کچھ یادیں میرے ذہن کے اندر۔ کچھ ہی دیر بعد ٹیکسی والے نے مجھے اپنی منزل مقصود پر پہنچا دیا۔ میں اترا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ایک گلی میں گھس گیا۔ مضطرب نظروں سے میں گھروں کے باہر لگی تختیاں پڑھ رہا تھا۔ کچھ ہی لمحوں کے بعد مجھے وہ گھر مل گیا جس کی طرف آج قدرت مجھے گھسیٹ کر لائی تھی۔ میں نے دروازے پر مضطرب مگر مودب دستک دی۔ ایک بار..... دو بار..... تین بار..... اور تیسری مرتبہ ایک بزرگ خاتون باہر آئیں۔

”السلام علیکم.....“

”علیکم السلام بیٹے..... کس سے ملنا ہے آپ کو؟“

”ج..... ج..... جی..... ش..... شفیق صاحب ہیں؟“

”ہاں ہیں، لیکن آپ کی تعریف؟“

”میں..... میں ندیم ہوں، ان کا پرانا شاگرد..... مجھے ان سے

ملنا تھا۔“

”اچھا! آ جاؤ.....“

وہ بزرگ خاتون مجھے اپنے ساتھ ایک کمرے میں لے گئیں

اور میں تیز دھڑکنوں کے ساتھ ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ وہ مجھے

ایک کمرے تک لے کر گئیں، دروازہ بند تھا۔

”بیٹے آپ اندر چلے جائیں، میں آپ کے لیے کچھ لے کر

آتی ہوں۔“

میں نے کانپتے ہاتھوں سے دروازہ کھولا۔ مجھے ایسا محسوس ہو

رہا تھا جیسے کوئی مجرم اپنا اعتراف گناہ کرنے جا رہا ہو۔ میں نے

آہستہ سے دروازہ کھولا، اندر ایک بزرگ پلنگ پر لیٹے اخبار پڑھ

رہے تھے۔ دروازے کی آہٹ نے انہیں متوجہ کیا۔ انہوں نے

اخبار کا ایک کونا نیچے کر کے اپنی بڑی سی عینک کے پیچھے سے مجھے

دیکھا اور ایک دم چونک گئے۔ میں نے جلدی سے ان کے پاؤں

پکڑ لیے۔

”سر میں ندیم احمد..... آپ کا پرانا شاگرد!“

میں نے اپنا مختصر مگر جامع تعارف کروانے کی کوشش کی۔ میرا

نام سن کر ان کے چہرے پر ایک لطیف سی مسکراہٹ کھل گئی۔ انہوں

نے اپنا نازک ہاتھ میرے چہرے پر پیار سے رکھا اور بولے۔

”بھلا میں تمہیں کیسے بھلا سکتا ہوں.....“

”سر آج سے تیرہ برس پہلے جب آپ ہمیں پڑھاتے تھے،

آپ کا ہماری کلاس کے ساتھ پہلا دن تھا.....“

اس کے بعد مجھ میں ہمت نہ تھی کہ میں آگے بول سکوں۔

میں شرم سے پانی پانی ہو رہا تھا۔ میں نے پھر بھی ایک کوشش کی۔

”سر اس دن میں نے جو کچھ آپ کے ساتھ کیا، میں اس کی معافی

مانگنے آیا ہوں، میں اپنے کیے پر بہت شرمندہ ہوں، آپ خدا را

مجھے معاف کر دیں۔ میں نے آپ کے ساتھ جو کچھ تیرہ برس پہلے

کیا تھا، آج اتنے عرصے کے بعد میرے ساتھ بھی ہو بہ ہو وہی

کچھ ہوا ہے۔“

وہ مسکرائے، ان کے چہرے پر ایک سکون تھا۔ انہوں نے

میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور گویا ہوئے۔

”میں نے تمہیں اسی دن معاف کر دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ تم

نے یہ حرکت ناسمجھی میں کی ہے جو اس عمر کے ہر بچے میں تھوڑی یا

زیادہ مقدار میں ہوتی ہی ہے۔ تم میرے بچوں کی طرح ہو، بھلا ایک

استاد نے کبھی اپنے شاگرد کے خلاف دل میں بغض رکھا ہے؟“ مجھے

محسوس ہوا جیسے کوئی بہت بھاری پتھر میرے دل سے ہٹ گیا ہو۔

وہ کچھ وقفے کے بعد پھر گویا ہوئے۔

”میں نے تو تمہیں معاف کر دیا تھا مگر تم جانتے ہو کہ پھر بھی

یہ تمہارے ساتھ کیوں ہوا؟“

”کیوں؟“ میرے جھکے سر سے آواز نکلی۔

”اس لیے کہ قدرت کا ایک رجسٹر ہوتا ہے جس میں ہمارے

تمام کے تمام اعمال لکھے جاتے ہیں اور ان میں سے ایسے اعمال

جن کا تعلق دوسروں کی ذات سے ہو وہ جلی حروف میں لکھ دیے

جاتے ہیں۔ اگر ہم نے ذرہ برابر بھی کسی کو نفع پہنچایا ہو تو اس کے

آگے اس کا بدلہ لکھ دیا جاتا ہے اور اگر ہم نے ذرہ برابر بھی کسی کو

نقصان پہنچایا ہو..... کسی کا دل دکھایا ہو تو اس کے آگے بھی اس کا

بدلہ لکھ دیا جاتا ہے اور زندگی میں جلد یا بدیر قدرت اس کا بدلہ ضرور

لیتی ہے تاکہ انسان کو اپنی بُرائی یاد آ جائے اور وہ اس پر پشیمان ہو،

شرمندہ ہو اور اسے احساس ہو کہ زندگی میں کسی کو تکلیف دے کر

انسان خود کبھی خوش نہیں رہ سکتا۔“

میں نے سر اٹھا کر ان کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ آگے

بڑھے، میری آنکھوں سے آنسو صاف کیے، مجھے ڈھیروں دعائیں

دیں اور مجھے اپنے گلے لگا لیا۔

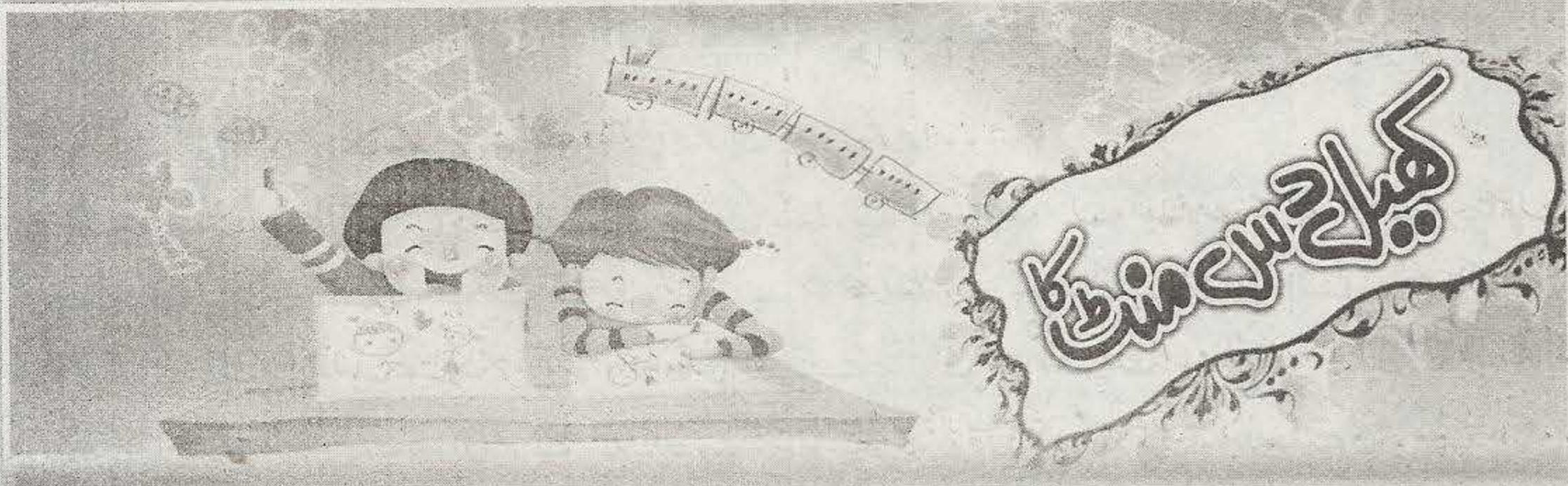
مجھے آج ہی اپنے استاد سے وہ بات پتا چلی جو میں ڈھیروں

کتابیں پڑھ کر بھی جان نہ سکا۔ میرے کاندھوں پر جو قرض تھا وہ

ادا ہو گیا اور میں اپنے شفیق استاد کی ڈھیروں دعائیں لے کر ایک

تروتازہ اور ہشاش بشاش وجود کے ساتھ واپس جا رہا تھا۔

☆☆☆



ر	ض	س	ن	ی	ٹ	س	د	ت	چ
ظ	خ	ز	ک	ق	ہ	پ	ل	و	ع
ش	ہ	ف	ٹ	ک	ر	ک	ب	ن	ء
ا	ث	ل	ا	م	ش	ط	ٹ	ڑ	خ
س	ی	و	س	ت	ی	ر	ا	ک	ی
ک	ظ	گ	ن	و	ڈ	و	ج	پ	گ
و	ب	ث	و	ص	ذ	ف	چ	غ	ہ
ا	ف	ڈ	ک	ے	ج	و	ب	ح	ا
ء	پ	ط	ر	ج	ن	ر	ط	ش	ک
ش	ص	ا	ف	ٹ	ب	ا	ل	ذ	ی

آپ نے حروف ملا کر دس کھیلوں کے نام تلاش کرنے ہیں۔ آپ ان ناموں کو دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں، اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر تلاش کر سکتے ہیں۔ آپ کے پاس وقت دس منٹ کا ہے۔ جن ناموں کو آپ نے تلاش کرنا ہے وہ یہ ہیں۔

کرکٹ، ہاکی، فٹ بال، گولف، تیراکی، ٹینس، جوڈو، شطرنج، اسکواش، اسنوکر

دودھ اور انسانی صحت

دودھ ایک مکمل اور بہترین غذا ہے۔ دودھ کے صحیح استعمال کا طریقہ درج ذیل ہے:

- ☆ پینے سے قبل دودھ کو اچھی طرح ہلا لینا چاہیے۔ ☆ دودھ کو چچ کے ذریعے گھونٹ گھونٹ کر کے، ایک وقت میں تقریباً آدھ سیر پینا چاہیے۔
- ☆ آدھ سیر دودھ پینے میں 3 سے 5 منٹ تک وقت صرف کرنا چاہیے۔ ☆ گھونٹ بھر دودھ کچھ دیر کے لیے منہ میں روک لینا چاہیے تاکہ اس میں لعاب کی آمیزش ہو جائے۔ ☆ ایک گھنٹہ بعد مزید آدھ سیر دودھ اسی طریقے سے پینا چاہیے۔ ☆ اگر طبیعت سیر نہ ہو رہی ہو تو ایک گھنٹے بعد پھر آدھ سیر دودھ پی لیا جائے۔ ☆ ہر دو گھنٹے بعد اسی طریقے سے دودھ پیتے رہنا چاہیے۔ ☆ اگر ممکن ہو تو صبح و شام تازہ دودھ استعمال کیا جائے ورنہ صبح کا دودھ ہی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ☆ گرمی کے دنوں میں حتی الامکان کوشش کرنی چاہیے کہ تازہ دودھ ہی پیا جائے۔ ☆ پہلا دور صبح ساڑھے دس بجے یا گیارہ بجے کے لگ بھگ شروع کرنا چاہیے اور ہر ایک گھنٹے بعد آدھ سیر دودھ پینا چاہیے۔

دودھ کے استعمال میں پرہیز و ہدایات

- حد سے زیادہ ٹھنڈا دودھ کبھی استعمال نہیں کرنا چاہیے، دودھ کو خراب ہونے سے بچانے کے لیے ٹھنڈی جگہ پر رکھنا تو مناسب ہوتا ہے لیکن ٹھنڈا دودھ استعمال کرنا کسی طور پر بھی مناسب عمل نہیں ہے۔ دودھ کو ابال کر بھی نہ پینا چاہیے کیونکہ ایسا کرنے سے اس میں موجود صحت مند مادے ضائع ہو جاتے ہیں اور ابلا ہوا دودھ قابض بھی ہوتا ہے۔ دودھ کے تین چار پیالے ایک ساتھ نہیں پی لینے چاہئیں، ایسا کرنے سے معدہ پھول جاتا ہے۔ دودھ ایک ہی سانس میں نہیں پینا چاہیے بلکہ اسے گھونٹ گھونٹ کر کے منہ میں کچھ دیر روک کر نگلنا چاہیے، عموماً افراد یہ کہتے ہیں کہ دودھ ہی پینا ہے جیسے بھی پیئیں لیکن یہ بات واضح ہونی چاہیے کہ جب تک اس میں لعاب اچھی طرح شامل نہ ہوگا تو دودھ پینے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ دودھ کے علاج کے دوران اور کوئی چیز نہ کھائی جائے، دودھ میں موجود غذائی اجزاء انسانی ضرورت کے مطابق ہوتے ہیں۔ مزید برآں اس میں پانی کی بھی کافی مقدار موجود ہوتی ہے جو معدے میں پہنچتے ہی دودھ سے الگ ہو جاتی ہے اور معدے میں جمع فاسد مادوں کو کھرچ کر باہر نکال دیتی ہے۔ ☆☆☆

ہر مل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 مئی 2014ء ہے۔

نام: _____
مقام: _____
دماغ لڑاؤ
مکمل پتا: _____
موبائل نمبر: _____

ہر مل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 مئی 2014ء ہے۔

کھوج لگائیے
نام: _____
شہر: _____
مکمل پتا: _____
موبائل نمبر: _____

میری زندگی کے مقاصد

کوپن پُر کرنا اور پاسپورٹ سائز رنگین تصویر بھیجنا ضروری ہے۔

نام _____
شہر _____
مقاصد _____
موبائل نمبر: _____

مئی کا موضوع کرکٹ میچ ارسال کرنے کی آخری تاریخ 08 مئی 2014ء ہے۔

ہونہار مصور

نام _____
عمر _____
مکمل پتا: _____
موبائل نمبر: _____



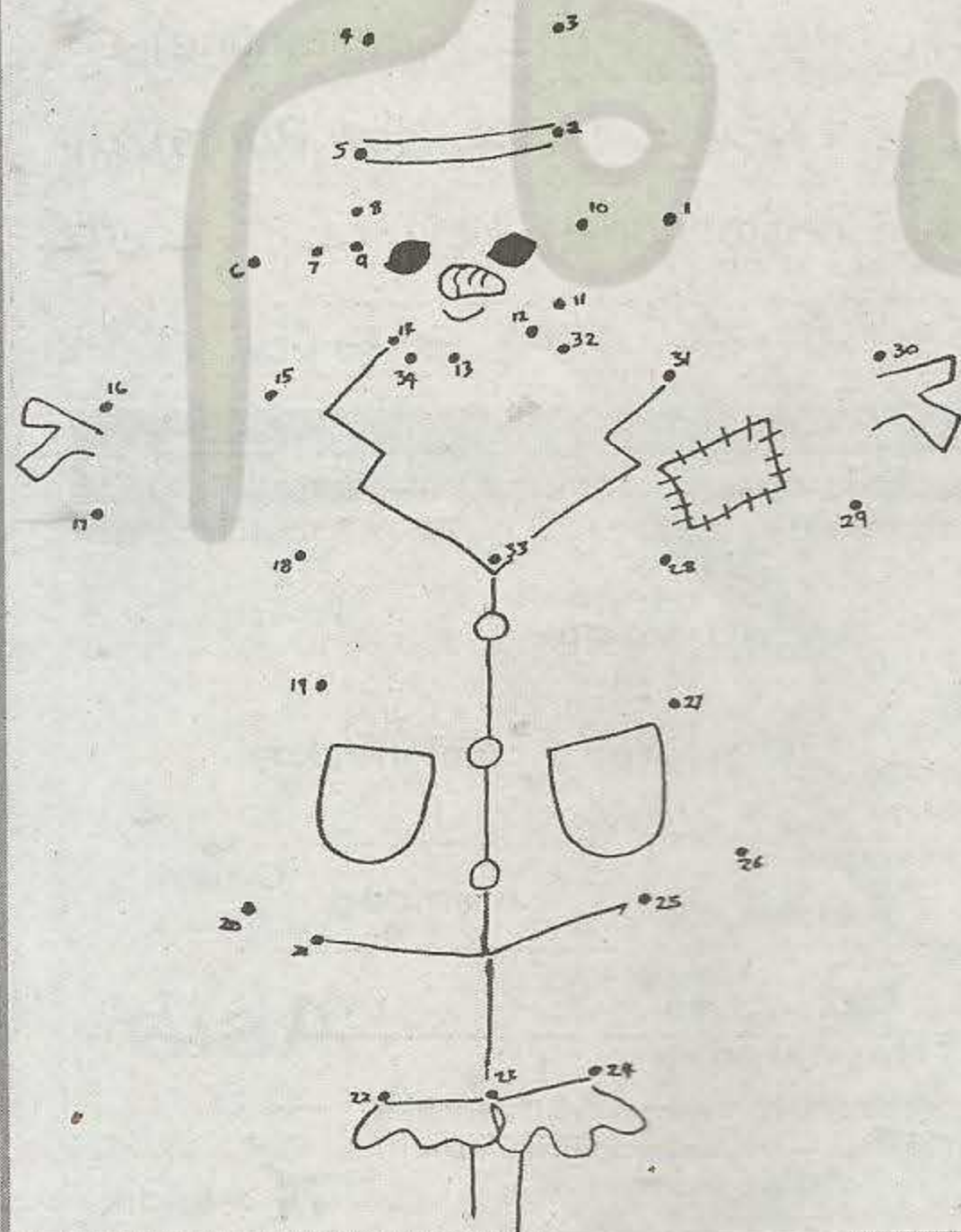
پوچھو تو جانیں

- 5- آندھی ہو یا تیز ہو
کبھی بجھے نہ ایک دیا
6- وہ آتا ہے یا وہ جاتا ہے
اور پتھروں کو وہ ملاتا ہے
7- کل کا اک بچہ نادان
چودہ دن میں ہوا جوان
8- ہر اک جانے اس کا نام
ہر گھر میں ہے اس کا کام
سیدھا ہو تو ہے تلوار
کبڑا ہو تو ہے بے کار
(محمد عبداللہ نیازی، بھکر)
9- خون اس کا میٹھا میٹھا
کڑوی کڑوی کھال
(گوہر زمان، گوجرانوالہ)

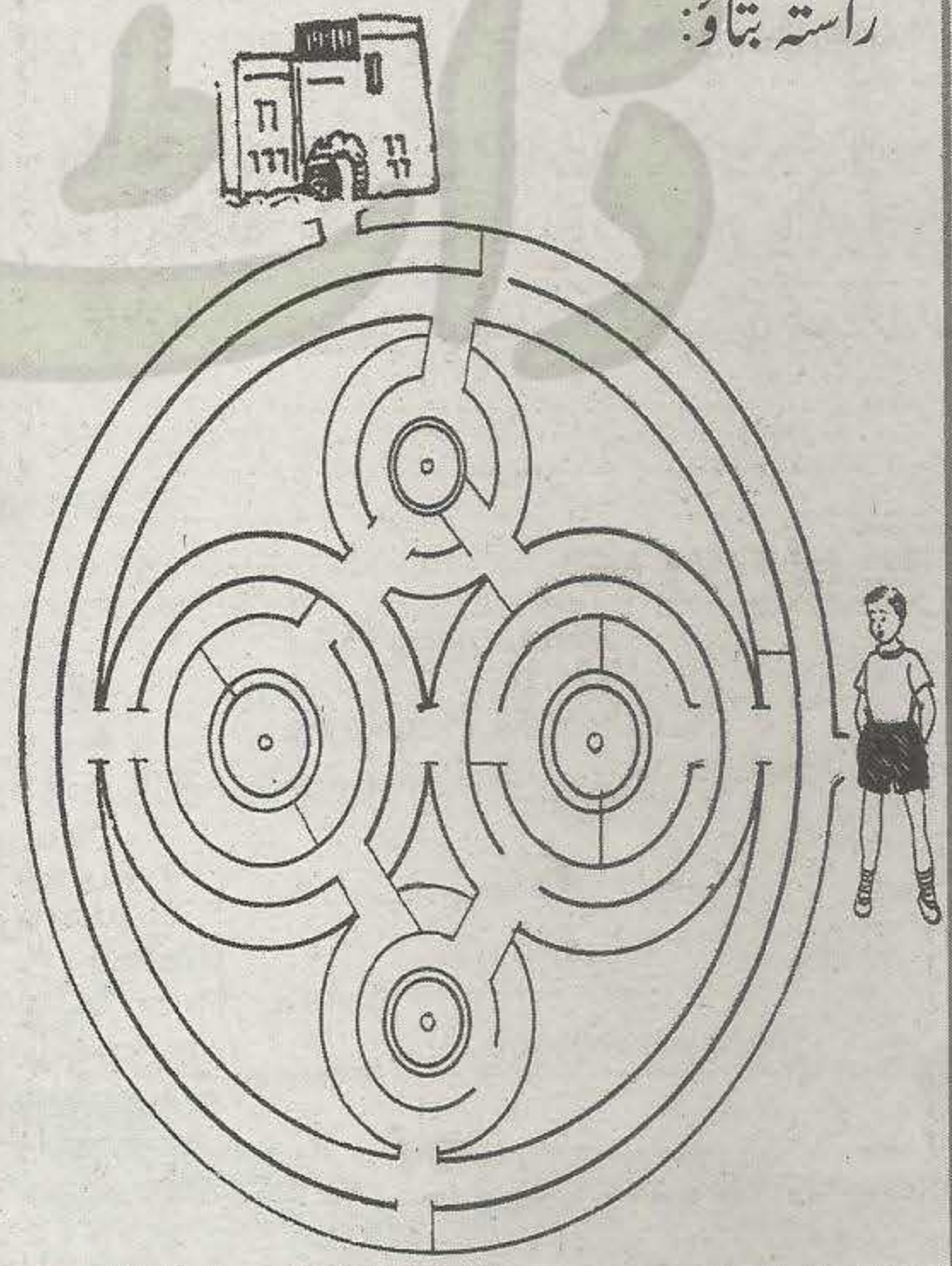
- 1- ہاتھ میں ڈنڈا نہ تلوار
ہے وہ ننھا چوکیدار
2- ہو اگر کوئی بخار کا مارا
کیوں نہ چڑھے پھر اس کا پارا
(سہیل عدیل، لاہور)
3- ایک پلیٹ میں بارہ انڈے
بیچ میں اس کے تین ڈنڈے
4- کھل جائے تو خوشبو دار
مرجھائے تو ہے بے کار
(مریم رضوان، راول پنڈی)

1-6 پتھر 8-پتھر 9-پتھر 7-پتھر 6-پتھر 5-پتھر
1-پتھر 2-پتھر 3-پتھر 4-پتھر 5-پتھر 6-پتھر 7-پتھر 8-پتھر 9-پتھر

نقطے ملاؤ اور رنگ بھرو:



راستہ بتاؤ:





ایک شہر دو براعظم، چار نام

ترکی کا شہر استنبول (Istanbul) دنیا کا واحد شہر ہے جس کی سرحدیں بیک وقت دو براعظموں، یورپ اور ایشیاء میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اس کے ایشیائی اور یورپی حصوں کو باسفورس (Bosphorus) نام کی ایک انتہائی تنگ آبناے (Strait) جدا کرتی ہے۔ یہ ایک قدیم شہر ہے، جس نے مختلف سلطنتوں کا عروج و زوال دیکھا ہے۔ تاریخ کے بدلتے ادوار میں اس اہم شہر کے چار نام رہے ہیں۔ کوئی اڑھائی ہزار سال پہلے استنبول پر بانی زس (Byzas) نامی ایک یونانی بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ اس کے دور میں استنبول کو ”بازنطین“ (Bazantium) کہتے تھے۔ تقریباً ایک ہزار سال پہلے رومی بادشاہ قسطنطین (Constantine) نے اس شہر پر قبضہ کر لیا اور اس کا نام ”نیا روم“ (New Rome) رکھا۔ کچھ عرصے بعد شہر کا نام تبدیل کر کے اس کے حاکم کے نام پر قسطنطنیہ (Constantinople) رکھ دیا گیا۔ استنبول اس نام سے بہت مشہور ہوا اور بعض لوگ تو اس کو اب تک

اسی نام سے جانتے ہیں۔ کوئی 500 سال پہلے اس شہر پر ترکوں کا قبضہ ہو گیا۔ انہوں نے اس کو موجودہ نام ”استنبول“ (Istanbul) دیا۔ استنبول ایک اہم تاریخی شہر ہے۔ اس کے آخری دور کے ترک حکمران مسلمان تھے۔ ان کی حکومت خلافت عثمانیہ کہلاتی تھی۔ اس دور میں استنبول نے بہت ترقی کی اور یہ یورپ اور ایشیاء کا ایک اہم تجارتی شہر بن گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک تو استنبول ترکی کا دارالخلافہ تھا اور دوسرے یہ یورپ اور ایشیاء کے درمیان آمد و رفت کا آسان ترین راستہ بھی تھا۔ آبناے باسفورس ایشیائی سمندر بحیرہ اسود (Black Sea) کو یورپی سمندر (Mediterranean) سے ملاتی ہے۔ ترکی کے عظیم رہنما کمال اتاترک کے زمانے میں ترکی کا دارالخلافہ استنبول سے ہٹا کر انقرہ منتقل کر دیا گیا لیکن استنبول کی تجارتی، تاریخی اور سیروسیاحت کے مرکز کی حیثیت آج تک برقرار ہے۔





شہری حزیہ

گئی۔ تمام کنیریں اور نوکر سارے محل میں شہزادی کو ڈھونڈنے لگے۔ تھوڑی ہی دیر میں انہوں نے محل کا چپہ چپہ چھان مارا لیکن شہزادی کا کوئی پتا نہ چلا، حتیٰ کہ دربانوں نے پائیں باغ کا بھی کونہ کونہ دیکھ لیا مگر شہزادی کہیں نہیں ملی۔ بادشاہ اور ملکہ کا پریشانی سے برا حال تھا۔ رات کے وقت محل کی نگرانی پر مامور محافظوں کو بلا کر ان سے پوچھ گچھ کی گئی لیکن سب نے لاعلمی کا اظہار کیا اور کہا کہ انہوں نے شہزادی کو محل سے باہر نکلتے نہیں دیکھا۔

”شاہی نجومی کو بلا کر اس سے پوچھا جائے۔ شاید وہ شہزادی کے بارے میں کچھ بتا سکے۔“ بادشاہ کے وزیر نے مشورہ دیا۔ وہ بھی شہزادی کی گم شدگی کی خبر سن کر فوراً محل چلا آیا تھا۔ وزیر کے مشورے پر شاہی نجومی کو بلایا گیا لیکن وہ بھی شہزادی کے بارے میں کچھ نہ بتا سکا۔

”ملک بھر میں اعلان کر دیا جائے کہ جو شخص شہزادی کو ڈھونڈ کر لائے گا اس کی شادی شہزادی سے کر دی جائے گی۔“ بادشاہ نے حکم دیا۔ بادشاہ کا حکم سنتے ہی شاہی ڈھنڈورچی گلی گلی میں پھیل گئے اور اعلان کرنے لگے۔

☆☆

بادشاہ کا اعلان سن کر شہزادی سے شادی کے لالچ میں بہت

”بادشاہ سلامت!..... ملکہ عالیہ! غضب ہو گیا..... ہم لٹ گئے..... برباد ہو گئے۔“ بادشاہ اور ملکہ ابھی ٹھیک طرح سے بے دار بھی نہیں ہوئے تھے کہ اچانک شاہی کنیر روتی پیٹتی ان کی خواب گاہ میں چلی آئی۔

”کیا ہو گیا؟..... کچھ بولو تو سہی.....“ ملکہ نے ہڑبڑا کر بستر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

”جان کی امان پاؤں تو عرض کروں، ملکہ عالیہ!“

”ہاں ہاں! امان ہے..... بولو کیا ہوا ہے؟“ بادشاہ نے جلدی سے کہا۔

”وہ..... وہ..... شہزادی حضور اپنے کمرے میں نہیں ہیں۔“

”کک..... کیا..... یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟“ بادشاہ گرج کر بولا۔

”بادشاہ سلامت! آپ کا اقبال بلند ہو میں سچ کہہ رہی ہوں۔“ کنیر گڑگڑاتے ہوئے بولی۔

”تمام کنیروں سے کہو شہزادی کو تلاش کریں۔“ بادشاہ نے کہا

اور ملکہ کے ساتھ شہزادی کی خواب گاہ کی طرف چل دیا۔ جب بادشاہ

اور ملکہ، شہزادی کے کمرے میں پہنچے تو اس کا بستر خالی پڑا تھا۔

شہزادی کا کچھ اتا پتا نہیں تھا۔ شاہی محل میں یہ خبر پھیلتے ہی ہلچل مچ

سے نوجوان شہزادی کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ وہ سب اپنے اپنے طور پر شہزادی کو ڈھونڈتے رہے لیکن نہ شہزادی کو ملنا تھا، نہ ہی وہ ملی۔ آخر کار مایوس ہو کر وہ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ اسی شہر میں ایک لڑکا رہتا تھا۔ اس کا نام وسیم تھا۔ وہ ایک لوہار کا بیٹا تھا۔ وسیم کا باپ وفات پا چکا تھا۔ وہ لوہا کوٹنے کا کام کرتا تھا۔ جب اس نے بادشاہ کا اعلان سنا تو اسے بہت دکھ ہوا۔ اس نے کسی لالچ کے بغیر بادشاہ کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا اور اللہ کا نام لے کر شہزادی کی تلاش میں نکل پڑا۔ ☆☆

وسیم کو گھر سے نکلے کافی دن ہو چکے تھے۔ وہ ابھی تک شہزادی کا کوئی سراغ نہیں لگا سکا تھا۔ وہ تھک کر چور ہو چکا تھا۔ وہ اب کسی حد تک مایوس ہو چکا تھا۔ اسے بہت بھوک لگ رہی تھی۔ کچھ ہی دور بڑی سڑک کے اس پار ایک چھوٹا سا ہوٹل بنا ہوا تھا۔ اس نے وہاں جانے اور کھانا کھانے کا فیصلہ کیا۔ وہ وہاں کچھ دیر آرام بھی کرنا چاہتا تھا۔ وہ سڑک کی جانب چلنے لگا۔ وہ سڑک پار کرنے ہی لگا تھا کہ اچانک اسے ایک آواز سنائی دی:

”بیٹا! ذرا مجھے سڑک تو پار کرا دو..... کافی دیر سے کھڑی ہوں، کوئی بات ہی نہیں سن رہا۔“ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ ایک خستہ حال نابینا بوڑھی اسے سڑک پار کرانے کے لیے کہہ رہی تھی۔ وہ بہت کم زور نظر آ رہی تھی۔ وسیم کو اس پر بہت ترس آیا۔ اس نے اس کا ہاتھ پکڑا اور سڑک کے دوسری طرف لے آیا۔ جب وہ سڑک کے دوسری طرف پہنچ گئے تو وسیم نے جانے کے لیے قدم بڑھائے لیکن اس بوڑھی نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا اور اسے کچھ دور درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف لے گئی۔ وہ جیسے کسی نادیدہ قوت کے زیر اثر اس کے ساتھ گھسٹتا چلا گیا۔ وہ بہت حیران تھا کہ کم زور سی دکھائی دینے والی بوڑھی میں اچانک اتنی طاقت کہاں سے آگئی۔ وہ ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ اسی وقت لوہے سے لوہا ٹکرانے کی آواز آئی اور وہ بوڑھی ایک پری میں تبدیل ہو گئی۔ وسیم یہ دیکھ کر ڈر گیا۔

”ڈرو نہیں بیٹا! میں تو تمہارا امتحان لے رہی تھی۔ میں جانتی ہوں جس کام کے لیے تم نکلے ہو۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم کسی لالچ کے بغیر بادشاہ کی مدد کرنا چاہتے ہو، لہذا میں تمہاری مدد کروں گی۔ میں پہلے بھی شہزادی کی تلاش میں نکلنے والوں کو آزماتی رہی ہوں مگر کوئی بھی میری آزمائش میں پورا نہیں اترتا۔ وہ سب غرض

کے بندے تھے، اس لیے ناکام و نامراد واپس لوٹے۔ سنو! شہزادی ناران کو لالی جادوگر نے سنہری جزیرے میں قید کر رکھا ہے۔ وہ شہزادی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے طلسمی آئینے میں دیکھ لیتا ہے کہ سب سے خوب صورت شہزادی کون سی ہے اور کہاں رہتی ہے۔ وہ ایک بہت طاقتور اور ظالم جادوگر ہے۔ تاہم وہ شہزادی کی مرضی کے بغیر اس سے شادی نہیں کرے گا۔ اس تک پہنچنا اور اس کی قید سے شہزادی کو رہائی دلانا بہت مشکل ہے۔ تمہیں ہمت سے کام لینا ہو گا۔ لالی جادوگر کی جان سیاہ رنگ کے ایک گلاب کے پھول میں ہے جو بلی کی شکل کا ہے۔ یہ پھول سنہری جزیرے میں اس کے محل کے تہہ خانے میں بنے ایک کنویں میں ہے۔ اس کنویں پر ہر وقت اس کے محافظ موجود رہتے ہیں۔ یہ تہہ خانہ اس کے رہائشی کمرے کے نیچے بنا ہوا ہے۔ اس کے رہائشی کمرے میں داخل ہوتے ہی سامنے کی دیوار کو تھپتھپانے سے کمرے کے ایک کونے کا فرش اپنی جگہ سے ہٹ جائے گا۔ وہاں سے تمہیں تہہ خانہ نظر آ جائے گا۔ تمہیں وہ پھول لے کر اسے مسلنا ہو گا۔ پھول کو مسلتے ہی لالی جادوگر مر جائے گا۔ سنہری جزیرہ یہاں سے جنوب کی طرف کوسوں دور ہے۔ پھر اس جزیرے تک پہنچنے کے لیے سانپوں کا صحرا اور آگ کا دریا عبور کرنا پڑتا ہے۔ سنہری جزیرہ دراصل ایک دلدل ہے۔ جو بھی وہاں قدم رکھتا ہے وہ اس میں دھنس جاتا ہے۔“

”اچھی پری مجھے بتائیں کہ میں اس تک کیسے پہنچ سکتا ہوں؟“ وسیم نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔

”یہ لو، یہ تمہیں سنہری جزیرے تک پہنچنے میں کام آئیں گی۔“ پری نے وسیم کو ایک انگوٹھی، ایک سیاہ چوندہ اور جوتوں کا ایک جوڑا دیتے ہوئے کہا۔

”یہ کس طرح میرے کام آئیں گی؟“ وسیم نے یہ سب چیزیں لیتے ہوئے پری سے پوچھا۔

”جب تم سانپوں کے صحرا میں پہنچو گے تو یہ انگوٹھی پہن لینا۔ تم جس طرف اس انگوٹھی کا رخ کرو گے وہاں سے سانپ ہٹتے جائیں گے اور تمہیں راستہ ملتا جائے گا۔ آگ کے دریا میں تم یہ چوندہ پہن لینا۔ اسے آگ کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی اور یہ جوتا تمہیں دلدل میں دھنسنے سے بچائے گا۔ آؤ اب میرا ہاتھ پکڑو اور اپنی آنکھیں بند کر لو، میں تمہیں سانپوں کے صحرا تک پہنچا دیتی ہوں۔“ وسیم نے



پری کا ہاتھ پکڑا اور آنکھیں بند کر لیں۔ ☆☆

”آنکھیں کھولو۔“ تھوڑی دیر بعد وسیم کو پری کی آواز سنائی دی۔ اس نے دیکھا کہ وہ ایک سرسبز و شاداب باغ میں کھڑے تھے۔

”اس باغ کے اس پار سانپوں کا صحرا ہے۔ آگے تمہارا کام ہے۔ ڈرنا مت، تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ جیسے میں نے تمہیں بتایا ہے، بس ویسے ہی کرتے جانا۔ سمجھے۔ میں اب چلتی ہوں۔“ پری نے کہا اور اس کے ساتھ ہی لوہے سے لوہا ٹکرانے کی آواز آئی اور وہ وسیم کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ پری کے

غائب ہوتے ہی وسیم نے اللہ کا نام لیا اور چل پڑا۔ جب وہ باغ کے دوسرے کنارے پر پہنچا تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس کے سامنے تاحد نگاہ سانپوں کا فرش بچھا تھا۔ زہریلے صحرائی سانپ پھنکارتے منہ سے آگ نکالتے بہت ہی خوف ناک منظر پیش کر رہے تھے۔ ایک لمحے کے لیے وہ ڈمک سا گیا لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے پری کی دی ہوئی انگوٹھی نکالی اور دائیں ہاتھ کی چھنگلی انگلی میں پہن لی۔ انگوٹھی پہنتے ہی اسے ایک عجیب طاقت کا احساس ہوا۔ اب اس نے پری کی ہدایت کے مطابق انگوٹھی کا رخ سانپوں کی طرف کیا۔ انگوٹھی کو دیکھتے ہی سانپوں میں بھگدڑ سی مچ گئی اور وہ ادھر ادھر کو بھاگنے لگے۔ اب اسے کچھ حوصلہ ہوا اور اس نے اللہ کا نام لے کر اس صحرا میں قدم رکھ دیا۔ سانپ انگوٹھی کو دیکھ کر ایک طرف ہٹتے گئے اور اسے راستہ ملتا گیا۔ کچھ ہی دیر میں اس نے آرام سے وہ صحرا پار کر لیا۔ صحرا کے دوسری طرف نکلنے کے بعد اس نے دیکھا کچھ فاصلے پر آگ کا دریا تھا۔ اب اسے وہ عبور کرنا تھا۔ اس نے فوراً پری کا دیا ہوا سیاہ چوغہ پہنا اور اس دریا میں اتر

گیا۔ اس نے دیکھا آگ چونے سے مس ہو رہی تھی لیکن اسے کوئی نقصان نہیں پہنچ رہا تھا۔ اسے اس کی تپش بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ سانپوں کے صحرا کی طرح جلد ہی اس نے وہ دریا بھی پار کر لیا۔ دریا پار کرتے ہی اس نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ کچھ فاصلے پر وہ سنہری جزیرہ تھا۔ اس کی تمام چیزیں سنہری رنگ کی تھیں جیسے وہ سب سونے کی بنی ہوئی ہوں۔ زمین، درخت، محلات سب کسی سنہری مادے سے بنے ہوئے تھے۔ سب سے عجیب بات یہ تھی کہ وہاں کوئی بھی ذی روح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہاں کوئی بھی نہیں رہتا تھا۔ جزیرے کے چاروں طرف آگ کا دریا تھا۔ وسیم نے پری کے دیئے ہوئے جوتے پہنے اور جزیرے میں داخل ہو گیا۔ وہ اس سنہری دلدل میں یوں چل رہا تھا جیسے سخت زمین پر چل رہا ہو۔ وہ جزیرے کے شمال جانب چلنے لگا۔ لالی جادو گر کا محل شمال میں جزیرے کے آخر میں تھا۔ جب وہ محل کے پاس پہنچا تو اس نے دیکھا، دروازے پر دربان کی جگہ ایک انتہائی خوب صورت سنہری سانپ کھڑا تھا۔ اس کے سر پر ایک سنہری تاج بنا

ہوا۔ یہ ایک بہت ہی زہریلا سانپ تھا۔ وہ جس کو ڈس لیتا تھا، اس کا جسم لمحوں میں پانی بن کر بہہ جاتا تھا۔ وسیم کو دیکھتے ہی وہ اس کی طرف پھنکارتا ہوا بڑھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس کے پاس پہنچ کر اسے ڈستا اس نے انگوٹھی والا ہاتھ اوپر اٹھایا۔ سانپ انگوٹھی دیکھتے ہی پیچھے کی طرف اچھلا اور ایک طرف تیزی سے ریگلتا ہوا غائب ہو گیا۔ وسیم اب جادوگر کے محل میں داخل ہو گیا۔ ☆☆

محل میں داخل ہوتے ہی وسیم نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ سارا محل بالکل خالی پڑا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہاں کوئی نہیں رہتا تھا۔ محل میں ہر طرف کمرے ہی کمرے بنے ہوئے تھے۔ وہ سب کمرے بند تھے۔ محل اور تمام کمرے بھی سنہری رنگ کے تھے جیسے سونے کے بنے ہوئے ہوں۔ وہ جنوب کی جانب چلتا گیا۔ جادوگر کا رہائشی کمرہ جنوب کی طرف بنا ہوا آخری کمرہ تھا۔ اسی کمرے کے تہہ خانے میں وہ کنواں تھا جس میں سیاہ گلاب کا وہ پھول تھا جس میں لالی جادوگر کی جان تھی۔ جیسے ہی وہ کمرے کی طرف مڑا ایک بہت بڑا دیو آدم بو آدم بو کہتا ہوا اس پر حملہ آور ہوا۔ اس کے منہ سے آگ نکل رہی تھی۔ وسیم کو فوری طور پر سمجھ نہیں آئی کہ کیا کرے۔ وہ اس اچانک افتاد سے گھبرا گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ دیو اس کا لقمہ بنا کر اسے ہڑپ کر جاتا، اچانک زور سے بجلی کڑکی۔ بجلی کی کڑک بن کر وہ دیو ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔ اسی وقت فضا میں ایک تلوار لہرائی اور مہربان پری کی آواز آئی۔ وہ وسیم سے کہہ رہی تھی:

”یہ لو اور اس کا سرتن سے جدا کر دو۔“ پری کی آواز سنتے ہی وسیم کے جسم میں جیسے بجلیاں سی بھر گئیں۔ اس نے تلوار پکڑی اور بجلی کی تیزی سے ہاتھ گھمایا۔ تلوار اس دیو کے سر کو گردن سے کاٹتی ہوئی نکل گئی۔ سر کٹتے ہی وہ دیو زمین پر گر کر تڑپنے لگا اور تھوڑی ہی دیر میں ٹھنڈا ہو گیا۔ اب وسیم کمرے میں داخل ہو گیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے جلدی سے سامنے کی دیوار کو تھپتھپایا۔ دیوار کے ساتھ ہی کمرے کے فرش کا ایک کونہ کسی ریلنگ کی طرح اپنی جگہ سے سرکتا گیا۔ وسیم نے دیکھا کہ وہاں سے سیڑھیاں نیچے جا رہی تھیں۔ سیڑھیوں میں گھپ اندھیرا تھا۔ اس نے اللہ کا نام لیا اور سیڑھیاں اترتا چلا گیا۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے اس نے ایک عجیب بات دیکھی۔ اس کی انگوٹھی کسی مشعل کی طرح چمک رہی تھی جس سے ہر طرف روشنی

پھیل رہی تھی۔ اس روشنی میں اسے نیچے جانے میں کوئی مشکل نہیں ہوئی۔ نیچے پہنچ کر اس نے دیکھا کہ کمرے کے درمیان میں ایک کنواں تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر کنویں میں جھانکا۔ کنویں میں تاریکی کی وجہ سے اسے کچھ نظر نہ آیا۔ اس نے انگوٹھی والا ہاتھ اوپر اٹھایا اور کنویں میں دیکھا۔ کنواں بہت گہرا اور خشک تھا۔ نیچے کنویں کی تہہ میں سبز رنگ کا ایک پودا اگا ہوا تھا۔ اس پر ایک بڑا سیاہ پھول لگا ہوا تھا۔ وہ بہت ہی عجیب و غریب پھول تھا۔ بظاہر وہ گلاب کا پھول تھا۔ اس کی پتیوں پر پیلے رنگ سے آنکھیں اور ناک کا نقشہ بنا ہوا تھا۔ غور سے دیکھنے پر وہ بلی کا منہ دکھائی دیتا تھا۔ کنویں کی تہہ میں ہر طرف سنہری تاج والے بے شمار سانپ کلبلا رہے تھے۔ وہ تعداد میں اتنے زیادہ تھے کہ کنویں کا فرش دکھائی ہی نہیں دے رہا تھا۔ وسیم نے ایک بار پھر اللہ کا نام لیا اور کنویں کی منڈیر پر چڑھ کر کسی بلی کی طرح ہاتھ اور پاؤں کے بل پر ریگلتا ہوا کنویں کی دیوار سے نیچے اترتا چلا گیا۔ نیچے پہنچتے ہی بہت سے سانپ اس کی طرف لپکے لیکن اس کے قریب آنے پر انگوٹھی کی روشنی سے پگھلتے گئے۔ انگوٹھی کی مدد سے اس نے باقی سانپوں کو بھی ہٹایا اور پھر فرش پر کود گیا۔ اب اس نے پھول کو توڑنے کے لیے اس کی ڈنڈی سے پکڑا۔ اس نے جیسے ہی ڈنڈی کو چھوا بجلی کا ایک زور دار کڑا کا ہوا اور اس کے ساتھ ہی تہہ خانے کی چھت نیچے گرنے لگی۔ اس نے جلدی سے پھول کو توڑا اور بھاگ کر کنویں کی دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ بجلی اب اور بھی زور سے کڑک رہی تھی۔ وسیم کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ پھر اچانک زمین زور زور سے ہلنے لگی جیسے بھونچال آ رہا ہو۔ وہ دیوار کے ساتھ چپک گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ جھٹکے کم ہو گئے۔ اب اس نے دیکھا کنویں میں دھواں بھرنے لگا تھا۔ اس کے گلے اور آنکھوں میں مرچیں سی لگنے لگی تھیں۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور سانس روک لیا۔

”ہا ہا ہا ہا..... ہی ہی ہی.....“ کنویں میں زور دار قہقہوں کی آواز گونجی۔ وسیم نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ دھواں چھٹ چکا تھا۔ اس کے سامنے ایک مکروہ شکل کا بوڑھا کھڑا قہقہے لگا رہا تھا۔

”کون ہو تم؟“ وسیم نے گرج دار آواز میں پوچھا۔

”ہا ہا ہا ہا..... تم مجھے نہیں جانتے مگر میں تمہیں جانتا

ہوں..... میں لالی جادوگر ہوں اور تم شہزادی ناران کو آزاد کرانے آئے ہو تا کہ تم اس سے شادی کر سکو..... مگر تمہیں میری طاقت کا اندازہ نہیں ہے..... میں تمہیں جلا کر راکھ کر دوں گا..... ہاہ ہاہ..... ہی ہی ہی.....“ لالی جادوگر نے دانت پیستے ہوئے کہا اور پھر منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے وسیم کی طرف پھونک ماری۔ آگ کی ایک لپٹ اس کے منہ سے نکل اور وسیم کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ وسیم یہ سب دیکھ کر بالکل بھی نہیں گھبرایا۔ اس نے آیت الکرسی کا ورد شروع کر دیا۔ آگ کی لپٹ اس کے قریب پہنچی اور چاروں طرف سے اسے گھیرے میں لے لیا۔ اب آگ چاروں طرف سے اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جادوگر قہقہے لگا رہا تھا۔ اگلے ہی لمحے ایک عجیب بات ہوئی۔ جیسے ہی آگ نے سیاہ چوغے کو چھوا، وہ بجھتی چلی گئی جیسے کسی نے اس پر پانی پھینک دیا ہو۔ یہ دیکھ کر جادوگر نے فوراً ہی کوئی اور منتر پڑھ کر پھونکا۔ اس مرتبہ ایک کالا ناگ اڑتا ہوا اس کی طرف آیا۔ اس کے منہ سے بھی آگ کی لپٹیں نکل رہی تھیں۔ اس نے وسیم کے گلے سے لپٹنا چاہا۔ وسیم نے اسی وقت انگوٹھی کا رخ اس کی طرف کر دیا۔ انگوٹھی کا رخ سانپ کی طرف ہوتے ہی وہ تیورا کر زمین پر گرا اور پھر غائب ہو گیا۔ سیاہ رنگ کا وہ پھول وسیم کے ہاتھ میں تھا۔ اب وہ اس کو اپنے ہاتھوں میں مسل دینا چاہتا تھا۔ یہ دیکھ کر جادوگر اس کے قدموں میں گر گیا اور گڑ گڑانے لگا:

”مجھے معاف کر دو..... میری جان بخش دو..... میں آئندہ کسی کو تنگ نہیں کروں گا۔“ لیکن وسیم نے مہربان پری کی ہدایت کے مطابق اس کی ایک نہیں سنی اور دونوں ہاتھوں سے سیاہ رنگ کے اس گلاب کے پھول کو مسل دیا۔ جادوگر زمین پر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ اس کے ساتھ ہی جزیرے میں ہر طرف کان پھاڑ دینے والے دھماکے ہونے لگے۔ دھماکوں سے زمین لرزنے لگی۔ وسیم کے لیے کھڑا ہونا مشکل ہو گیا۔ اس نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے اور اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا لیکن وہ زیادہ دیر تک کھڑا نہ رہ سکا۔ یکا یک ایک دھماکہ اس کے قریب ہوا اور وہ کانوں پر ہاتھ رکھے نیچے گرتا چلا گیا۔ ”اٹھو! جلدی کرو..... شہزادی تمہارے انتظار میں کب سے کھڑی ہے۔“

☆☆

اسے دُور کسی کنویں سے آواز آئی۔ اسے یہ آواز کچھ جانی

پہچانی محسوس ہوئی۔ اس کے سارے حواس بے دار ہو گئے اور وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے دیکھا وہی مہربان پری اس کے پاس کھڑی تھی جس نے آتے ہوئے اس کی مدد کی تھی۔ سنہری جزیرہ اپنے طلسم سمیت غائب ہو چکا تھا۔

”کہاں ہے شہزادی؟“ وسیم نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”وہ..... اس طرف.....“ پری نے دُور ایک جھونپڑی کی

طرف اشارہ کیا۔ وہ دونوں اس جھونپڑی کی طرف چل دیے۔

جھونپڑی کے پاس پہنچ کر انہوں نے شہزادی کو باہر بلایا۔

”اب تم دونوں اپنی آنکھیں بند کر لو اور میرے ہاتھوں کو پکڑ

لو۔“ شہزادی کے باہر آتے ہی پری نے ان دونوں سے کہا۔ انہوں

نے ایسے ہی کیا۔ آنکھیں بند کرتے ہی انہیں محسوس ہوا جیسے ان کا

وزن ختم ہو گیا تھا۔ وہ کسی تنکے کی مانند ہوا میں اوپر اٹھتے چلے

گئے۔ تھوڑی دیر بعد ان کے قدم کسی سخت چیز سے ٹکرائے۔

”آنکھیں کھولو۔“ پری نے ان سے کہا۔ وسیم نے دیکھا وہ

سانپوں کے صحرا کے ساتھ والے باغ میں کھڑے تھے۔ وہ صحرا بھی

غائب ہو چکا تھا۔ ایک طرف ایک گھوڑا کھڑا تھا۔

”یہ گھوڑا تمہارے لیے ہے۔ تم اب جا سکتے ہو۔ اللہ تمہارا

حامی و ناصر ہو۔“ پری نے کہا اور غائب ہو گئی۔ وسیم نے

شہزادی کو گھوڑے پر بٹھایا اور اس کے محل کی طرف روانہ ہو

گئے۔ منزلوں پر منزلیں طے کرتے ہوئے وہ تیسرے دن محل

میں پہنچ گئے۔

”شہزادی آگئی..... شہزادی آگئی۔“ ان کے محل پہنچتے ہی یہ خبر

جنگل کی آگ کی طرح ہر طرف پھیل گئی۔ بادشاہ اور ملکہ، شہزادی کو

دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ وہ یہ جاننے کے لیے بے چین تھے کہ وہ

اچانک کہاں غائب ہو گئی تھی اور پھر کیسے واپس آئی۔ شہزادی نے

انہیں ساری بات بتائی اور کہا۔ ”یہ نوجوان بہت بہادر اور دردمند

دل رکھنے والا ہے۔ اگر یہ نہ آتا تو میں کبھی اس جادوگر کی قید سے نہ

نکل سکتی۔“ بادشاہ وسیم کی ہمت اور بہادری سے بہت متاثر ہوا اور

اس سے شہزادی کی شادی کر دی اور اسے اپنا وزیر بنا لیا۔ یوں وسیم

نے اپنی ہمت اور بہادری سے ایک اچھا مقام حاصل کر لیا اور وہ

سب محل میں ہنسی خوشی رہنے لگے۔

☆.....☆.....☆

i۔ پروین شاکر ii۔ ڈاکٹر وزیر آغا iii۔ ممتاز مفتی

9۔ حمق کس کی جمع ہے؟

i۔ عقل مند ii۔ شریف iii۔ احمق

10۔ حیدر کزار کس کا لقب ہے؟

i۔ حضرت عثمان ii۔ حضرت علی iii۔ حضرت ابوبکر

جوابات علمی آزمائش اپریل 2014ء

1۔ مسجد الحرام 2۔ حضرت آدم 3۔ حدیث 4۔ وقت 5۔ چین 6۔ 1799ء 7۔ مسجد قرطبہ 8۔ پولو 9۔ عبدالقیوم خان 10۔ چترال

اس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے 3 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیے جا رہے ہیں۔

☆ محمد قمر الزمان، خوشاب (150 روپے کی کتب)
☆ اقصیٰ سجاد، راول پنڈی (100 روپے کی کتب)
☆ فہد امین، گوجرانوالہ (90 روپے کی کتب)

دماغ لڑاؤ سلسلے میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی:

کرن سلیم، سیال کوٹ۔ خدیجہ فہد، گوجرانوالہ۔ روحین زمان، کرک۔ عبیرہ ندیم، اسلام آباد۔ زینب محمود، جلمہن شریف۔ ردا فاطمہ فریال، راول پنڈی۔ محمد گوہر مصطفیٰ، صادق آباد۔ بسمہ نور، پشاور۔ محمد فیصل ہزاروی، محمد عدیل رفیع قادری، محمد ذیشان اکرم قادری، محمد حبان ادلیس قادری، حسنین رضا قادری، مظہر اکرم قادری، محمد سیف الرحمن قادری، مجیب الرحمن قادری، محمد فریاد علی قادری، خدیجہ نشان، نور فاطمہ قادری، حسن رضا سردار، محمد معین الدین قادری، کاموکی۔ تحریم مریم شاہد، ملتان۔ سلیمان علی اعوان، واہ کینٹ۔ محمد وجاہت، مریم رضوان، راول پنڈی۔ فاطمہ عمران، اسلام آباد۔ محمد ارسلان ملتانی، مدثر لطیف، عاصم طفیل، گوجرانوالہ۔ ضحیٰ بدر، لاہور۔ ردا فاطمہ، ستیانہ بنگلہ۔ ربیعہ اقبال، فراز علی سلنگی، صفارشید، نادر علی، محمد رشید، آفاق شفیق، منزل عطاء، محمد بشارت، صہیب نور، کراچی۔ طہ الیسن، حیدر آباد۔ خدیجہ ساحر، کشف سعید، زینب سلیمان، ساہی وال۔ عمارہ بلوچ، ڈیرہ غازی خان۔ حائقہ عزیز، ڈیرہ اسماعیل خان۔ ایمان فاطمہ، راول پنڈی۔ رانا بلال احمد، بھکر۔ عروب ملک، لاہور۔ محمد سلیمان شاہد، کراچی۔ زینب ناصر، فیصل آباد۔ اسد علی انصاری، ملتان۔ محمد حسان، راول پنڈی۔ شہزادی خدیجہ شفیق، لاہور۔ محمد عمر عباس

آوانہ، کھاریاں۔ محمد حمزہ مقصود، لاہور۔ نورالہدیٰ، ملتان۔ ☆☆



درج ذیل دیے گئے جوابات میں سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

1۔ قرآن پاک کی ایک سورۃ مکڑی کے نام پر ہے۔ سورۃ کا نام بتائیں؟

i۔ الرعد ii۔ عنکبوت iii۔ الدخان

2۔ وہ کون سی پہلی جنگ تھی جس میں نبیؐ نے حصہ لیا؟

i۔ جنگ بدر ii۔ جنگ فجار iii۔ جنگ احد

3۔ مشہور پاکستانی خطاط صادقین کا اصل نام کیا تھا؟

i۔ علی نقوی ii۔ احمد نقوی iii۔ تنویر نقوی

4۔ یہ نعتیہ شعر کس کا ہے؟

دل جس سے زندہ ہے وہ تمنا تم ہی تو ہو

ہم جس میں بس رہے ہیں وہ دنیا تم ہی تو ہو

i۔ مولانا ظفر علی خان ii۔ علامہ اقبال iii۔ احمد فراز

5۔ جھیل ”بچو“ کہاں واقع ہے؟

i۔ کاغان، کے پی کے ii۔ دادو، سندھ iii۔ ناران، کے پی کے

6۔ ”ڈیوس کپ“ کس کھیل میں دیا جاتا ہے؟

i۔ لان ٹینس ii۔ بیڈمنٹن iii۔ اسکواش

7۔ پاکستان کا کون سا شہر فون انڈسٹری کی وجہ سے مشہور ہے؟

i۔ ہری پور، ہزارہ ii۔ واہ کینٹ iii۔ ٹیکسلا

8۔ ”اسلام آباد پاکستان کا کپسول ہے جس میں سارے پاکستان کی

خوشبو بند ہے۔“ یہ قول کس کا ہے۔

مئی 2014

تالیفات

24

میری زندگی کے مقاصد



صباحت بی بی، پشاور
میں بڑی ہو کر ایک باعمل مسلمان
ہوں گی۔



تور طارق، لاہور
میں ڈاکٹر بن کر اپنے والدین کی
خدمت اور ملک کا نام روشن کروں
گی۔



اقصی شہزادی، گجرات
میں ڈاکٹر بن کر غریبوں کا مفت
علاج کروں گی۔



محمد سیف اللہ، اسلام آباد
میں سرجن ڈاکٹر بن کر غریبوں کا
مفت علاج کروں گا۔



اسامہ احمد، گجرات
میں الیکٹرونکس کے شعبے میں پاکستان
کا نام روشن کروں گا۔



محمد حذیفہ منصور، اسلام آباد
میں پاک فوج میں شامل ہو کر ملک و
قوم کی خدمت کروں گا۔



رابعہ سلیم، فیصل آباد
میں ڈاکٹر بننا چاہتی ہوں۔



تور العین، لاہور
میں ڈاکٹر بن کر ملک و قوم کا اور
اپنے والدین کا نام روشن کروں گی۔



فرقان علی، خان پور
میں ڈاکٹر بن کر غریبوں کا مفت
علاج کروں گا۔



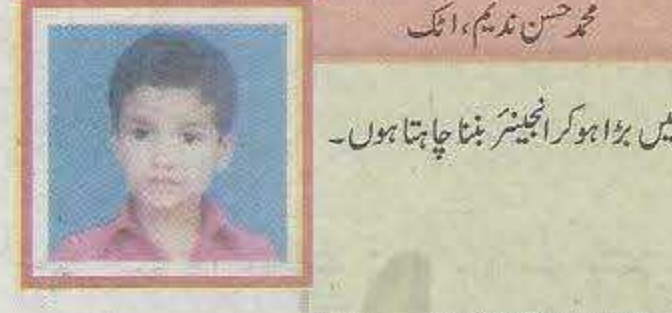
محمد سیف اللہ، لیچی
میں قرآن حفظ کروں گا اور اسلام
کی تبلیغ کروں گا۔



مریم رضوان، راولپنڈی
میں سائنس دان بن کر ملک و قوم کی
خدمت کروں گی۔



محمد فیصل ہزاروی، صادق آباد
میں ڈاکٹر بن کر انسانیت کی خدمت
کروں گا۔



محمد حسن ندیم، انک
میں بڑا ہو کر انجینئر بننا چاہتا ہوں۔



مریم عتیق، لاہور
میں ڈاکٹر بن کر غریبوں کا مفت
علاج کروں گی۔



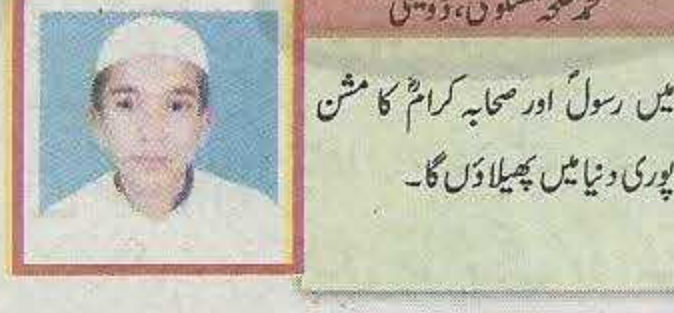
محمد گوہر مصطفیٰ، صادق آباد
میں ڈاکٹر بن کر انسانیت کی خدمت
کروں گا۔



ایمان فاطمہ، راولپنڈی
میں ڈاکٹر بن کر غریبوں کا مفت
علاج کروں گی۔



محمد احمد خان غوری، بہاول پور
میں آرمی آفیسر بن کر ملک و قوم کی
خدمت کروں گا۔



محمد طلحہ جھنگوی، ڈوبلی
میں رسول اور صحابہ کرام کا مشن
پوری دنیا میں پھیلاؤں گا۔



شہیر ملک، لاہور
میں آٹوموبائل انجینئر بن کر ملک و
قوم کی خدمت کروں گا۔



وجیہہ الحسن، راولپنڈی
میں بڑا ہو کر پائلٹ بنوں گا۔



نشہ رانی، کانیوالہ
میں اچھا انسان اور ایک کامیاب
انجینئر بننا چاہتی ہوں۔



فراز علی، کراچی
میں بڑا ہو کر انزفوس میں جاؤں گا
اور ملک کی سرحدوں کی حفاظت
کروں گا۔



سمراء حمید، لاہور
آئی ایم ایف کے قرضوں سے
نجات دلاؤں گی۔



غیسرہ نعمان بیٹ، بھکر
میں انشاء اللہ سائنس دان بن کر
ملک و قوم کی خدمت کروں گی۔



تور فاطمہ، اسلام آباد
میں سرجن ڈاکٹر بن کر غریبوں کا
مفت علاج کروں گی۔



محرم محرم

(شاعر: شاہد حسین)

ہمارا پرچم

سبز ہلالی ہمارا پرچم
ہم کو جان سے پیارا پرچم
آزادی کی نعمت کا ہے
جیسے ایک اشارہ پرچم
چاند کے جیسا میری نظر میں
آنکھ کا میری تارا پرچم
لہراتا ہے سینہ تن کے
شان لیے یہ نیارا پرچم
اٹھ کر سیلوٹ کریں ہم اس کو
جو ہے دل کا سہارا پرچم

(عائشہ رزاق، وزیر آباد)

بسم اللہ کی برکت

ایک یہودی لڑکی مسلمان ہوئی تو ہمارے نبی اکرمؐ نے پہلے
سبق کے طور پر نصیحت کی کہ ہر کام سے پہلے ”بسم اللہ“ ضرور پڑھا
کر۔ لڑکی نے ایسا ہی کیا۔ اس کے باپ کو بہت غصہ آیا۔ وہ اسے
قتل کر دینا چاہتا تھا لیکن قتل کے لیے کسی بہانے کی ضرورت تھی۔
اس نے ایک ترکیب سوچی اور اپنی بیٹی کو سونے کی انگوٹھی رکھنے کے
لیے دی۔ لڑکی نے بسم اللہ پڑھ کر انگوٹھی اپنے پاس رکھ لی۔ رات کو
یہودی نے چپکے سے انگوٹھی اٹھائی اور دریا میں پھینک دی۔ اس کا
خیال تھا کہ کل وہ اپنے چند مہمانوں کے سامنے لڑکی سے انگوٹھی
واپس طلب کرے گا اور جب لڑکی انگوٹھی نہ دے سکے گی تو وہ اس
بہانے سے اسے قتل کر دے گا۔ دوسرے روز اس نے بہت سے
مہمانوں کو بلایا اور کھانے کے لیے مچھلی لے آیا۔ لڑکی نے پکانے
کے لیے بسم اللہ پڑھ کر مچھلی کاٹی تو اس کے پیٹ میں سے انگوٹھی
نکل آئی جس کی کمشدگی پر وہ پریشان تھی۔ مہمانوں کے سامنے
یہودی نے انگوٹھی مانگی تو لڑکی نے انگوٹھی دی۔ یہودی بہت حیران
ہوا اور جب اس نے تمام قصہ سنا تو بسم اللہ کی برکت کا بہت قائل

(عروسی فاروقی)

بھول بھلکرو

تھا اک لڑکا بھول بھلکرو
سب اسے کہتے تھے گھن چکر
کام تھا اس کا بات بھلانا
اماں اور ابا کو ستانا
پیسے کچھ اماں نے تھمائے
تاکہ دکان سے سبزی لائے
فوراً ہی بازار میں آیا
جیب میں پیسے ڈال کے لایا
ایک دکان پہ دیکھی برنی
بھول گیا لینی ہے سبزی
برنی لے کر کھانے لگا وہ
گھر کی جانب آنے لگا وہ
گھر پہنچا تو شامت آئی
کی ابا نے خوب پٹائی

(شانزے شاہین، بہاول پور)

بادل

کالے بادل آئیں گے
آ کر مینہ برسائیں گے
مینہ میں لوگ نہائیں گے
کالے بادل آئیں گے
گرج گرج کر آئیں گے
بجلی کو چمکائیں گے
ہم بھی شور مچائیں گے
کالے بادل آئیں گے
بلبل گانا گائے گی
کوئل گیت سنائے گی
مینڈک بھی ٹرائیں گے
کالے بادل آئیں گے

مئی 2014

تعلیمی تربیت

26

ہوا اور مسلمان ہو گیا۔

منحوس

(صوفیہ عبداللہ، پشاور)

ایک تو ہم پرست بادشاہ شکار کھیلنے جا رہا تھا۔ راستے میں اس نے کسی بد صورت شخص کو دیکھا اور سوچ لیا کہ یہ منحوس ہے۔ حکم دیا کہ اسے کنویں میں بند کر دو اور جب تک ہم شکار سے واپس نہ آئیں، بند ہی رہنے دو۔

بادشاہ کو خوب شکار ملا، شام کو واپسی ہوئی تو بد نصیب شخص کو بھی رہائی ملی۔ اس نے رہائی پا کر بادشاہ کی قدم بوسی کی اور کہا: ”جان کی امان پاؤں تو کچھ کہوں؟“ بادشاہ نے کہا: ”بولو۔“

”آپ نے میرا چہرہ دیکھا اور آپ کو خوب شکار ملا جب کہ میں نے آپ کا چہرہ دیکھا تو سارا دن اندھے کنویں میں قید رہا۔ اب بتائیے منحوس کون ہوا؟“ بادشاہ لا جواب ہو گیا۔

انمول باتیں

(حامد علی، جوہر آباد)

☆ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا کیوں کہ شرک سب سے بڑا گناہ ہے۔

☆ ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرنا کہ شکر کرنے سے نعمتوں میں برکت ہوتی ہے۔

☆ باقاعدہ نماز پڑھنا کہ نماز بُرے کاموں سے روکتی ہے۔

☆ چغلی اور غیبت نہ کھانا، ان سے انسان کی قدر کم ہو جاتی ہے۔

☆ لوگوں سے بے رخی اور لاپرواہی نہ کرنا، ایسا آدمی مصیبت میں اکیلا رہ جاتا ہے۔

☆ زمین پر اکڑ کر اور غرور سے نہ چلنا، اللہ کو غرور اور تکبر پسند نہیں۔

☆ لوگوں سے ان کے مرتبے اور عمر کے مطابق بات کرنا، اس سے ان میں ہر دل عزیزی اور محبت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

☆ اونچی آواز اور بُرے لہجے میں بات نہ کرنا کیوں کہ گدھے کی آواز اگرچہ سب سے اونچی ہے مگر بہت بُری ہے۔

مہکتی کلیاں

(گوہر زمان، گوجرانوالہ)

☆ چیزیں استعمال کے لیے اور لوگ پیار کے لیے ہوتے ہیں۔ بات تب بگڑتی ہے جب چیزوں سے پیار اور لوگوں کو

استعمال کیا جائے۔

☆ مظلوم کا ہر آنسو ظالم کے لیے بددعا بن کر اس کی آنکھ سے ٹپکتا ہے۔

☆ استاد وہ آفتاب ہے جو ہر درو بام پر یکساں چمکتا ہے۔

☆ خوبی وہ ہے جس کا اعتراف دشمن بھی کریں۔

☆ دل اگر سیاہ ہو تو چمکتی آنکھ بھی کچھ نہیں کر سکتی۔

سنہری اقوال

(ایمان علی، راول پنڈی)

☆ اپنے دل کا غم دل میں رکھو، لوگ سنیں گے تو ہنسی اڑائیں گے اور غم کوئی نہ جانے گا۔

☆ پریشانی حالات سے نہیں، خیالات سے پیدا ہوتی ہے۔

☆ امید اس خوشی کا نام ہے جس کے انتظار میں غم کے ایام سمٹ جاتے ہیں۔

☆ زندگی موت کے تعاقب میں ہے اور موت زندگی کے پیچھے آ رہی ہے۔

☆ جو انسان ارادہ کر لیتا ہے، اس کے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔

☆ بے وقوف کے ساتھ جنت میں بیٹھنے سے عقل مند کے ساتھ قید خانے میں بیٹھنا بہتر ہے۔

☆ جو اچھے کو اچھا نہ جانے وہ بُرے کو بھی بُرا نہیں سمجھتا۔

☆ ہر شخص ایک کتاب ہے بشرطیکہ آپ کو پڑھنا آتا ہو۔

☆ چاند کے بغیر رات بے کار ہے اور علم کے بغیر ذہن۔

☆ چڑیاں اگر متحد ہو جائیں تو شیر کی کھال کھینچ سکتی ہیں۔

جلدی کرنا

(نعمان حیدر، لاہور)

☆ جلدی کرنا بہت بُری چیز ہے مگر پانچ چیزوں میں اچھی ہے۔

☆ مہمان کے ساتھ کھانے لگانے میں۔

☆ میت کی تجہیز و تکفین کرنے میں۔

☆ بالغ لڑکی کا نکاح کرنے میں۔

☆ قرض ادا کرنے میں۔

☆ گناہ سے توبہ کرنے میں۔

☆.....☆.....

زبیدہ سلطانہ

مخاورہ کہانی

ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دینا

جھنجھلا کر چاقو کے ایک ہی وار میں اپنی ناک کی نوک کاٹ کر دور پھینک دی اور پھنکار کر بولا:

”یہ لو..... اب کہاں بیٹھو گی؟ ہم نے اڑا ہی اڑا دیا.....“

گھر کی عورتیں واویلا کرنے لگیں..... ”ارے بد بخت! یہ کیا کیا؟“ ماں نے اپنا سر پیٹتے ہوئے کہا۔

”اچھا تو ماں اور کیا کرتا، ناک پر مکھی بیٹھنے دیتا؟“ وہ دھاروں بہتا خون صاف کرتے ہوئے بولا۔

ایسے بد مزاج آدمی کے لیے، جو کسی کی بات برداشت نہ کرے اور ہر حال میں اپنی انا کو مسئلہ بنائے، تب یہ مخاورہ بولا جاتا ہے۔



زربینہ کا شوہر بے حد بد مزاج اور چڑچڑا تھا۔ ذرا سی بات بھی برداشت نہ کرتا تھا۔ اپنے جھگڑالو اور گستاخ روئیے کی وجہ سے کئی ملازمتوں سے اسے جواب مل چکا تھا۔ سو سو جتن کر کے ملازمت تلاش کرتا، مگر چند مہینوں میں ہی کوئی نہ کوئی جھگڑا کھڑا کر کے نوکری سے جواب مل جاتا۔ ماں لاکھ سمجھاتی کہ شمس! تم خود میں برداشت کی عادت پیدا کرو، کچھ نرمی اختیار کرو مگر وہ تو ماں سے بھی الجھ پڑتا۔ بیوی تو اس سے بات تک کرتے ڈرتی تھی۔

ایک دن کیا ہوا کہ شمس صحن میں بیٹھا گنا چوس رہا تھا۔ ہاتھ میں بڑا سا چاقو لیے گنا چھیل چھیل کر گنڈیریاں بناتا اور چوستا۔ کھیاں اسے بے حد تنگ کر رہی تھیں۔ گنے کے موسم میں کھیاں ویسے بھی بہت ہوتی ہیں اور سردیوں کی نکھری ہوئی دھوپ بھی انہیں بہت پسند ہوتی ہے۔ شمس دھوپ میں بیٹھا تھا۔ اوپر سے گنے کے چھلکے اس کے ارد گرد پھیلے تھے۔ مکھیوں کے لیے اس سے اچھی جگہ اور کون سی ہو سکتی تھی، وہ اس کے آگے پیچھے بھنبھنار ہی تھیں۔ ایک دو کھیاں تو اتنی بے تکلف ہوئیں کہ اس کی ناک پر جہاں کافی مٹھاس لگی ہوئی تھی، بار بار آ بیٹھتیں۔ وہ بار بار انہیں ہاتھ ہلا کر اڑاتا مگر وہ کب باز آنے والی تھیں۔ ایک دو مرتبہ تو وہ اس کے نتھوں میں گھس گئیں۔ اس کا نام بھی شمس تھا، جو کبھی کسی کی من مانی برداشت نہ کرتا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ مکھیوں کی یہ جرأت برداشت کرتا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور

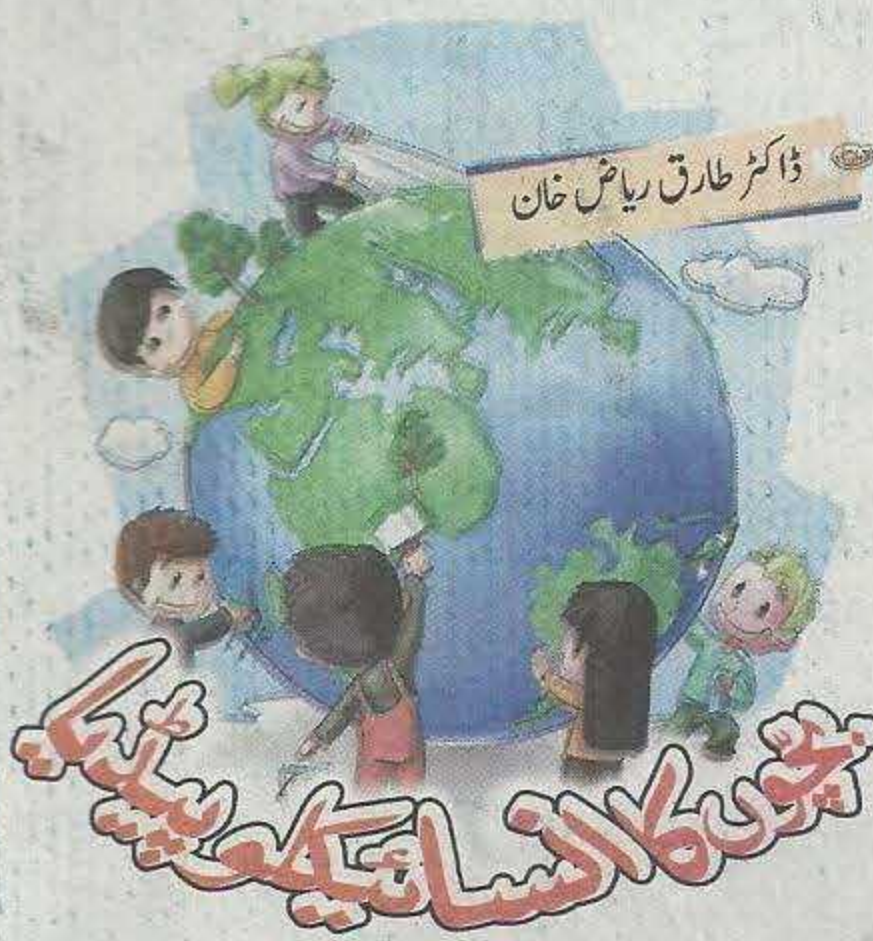
کے علاوہ مصر میں قاہرہ درس گاہ (کالج) میں پڑھایا۔ ابن خلدون کی تصانیف کے یونانی، فرانسیسی، فارسی، اسپینی اور انگریزی ترجمے کیے گئے۔ تعلیم و تحقیق کا یہ روشن ستارہ 19 مارچ 1406ء کو ڈوب گیا۔ ابن خلدون کو عمرانیات اور تاریخ کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ آپ کی تصنیف مقدمہ ابن خلدون تاریخ، سیاست، عمرانیات، اقتصادیات اور ادبیات کا بیش بہا خزانہ ہے۔ تیونس اور مصر میں ابن خلدون کے مجسمے آج بھی موجود ہیں۔ تیونس نے آپ کی یاد میں ڈاک ٹکٹ بھی جاری کیا تھا۔

پلوٹو

پلوٹو (Pluto) سیارہ کبھی ہمارے نظام شمسی کا حصہ تھا مگر 2006ء سے اسے اس سسٹم سے نکال دیا گیا ہے۔ یہ سیارہ کلے ڈے ڈبلیو ٹومبگ (Clade.W.Tombaugh) نے 18 فروری 1930ء میں دریافت کیا۔ یہ سیارہ سورج سے تین ارب 67 کروڑ میل کے فاصلے پر ہے۔ یہ سورج کے گرد 247 سال اور



225 دنوں میں اپنی گردش پوری کرتا ہے۔ اس کا دن زمین کے 6 دن، 9 گھنٹے اور 17 منٹ کے برابر ہوتا ہے۔ ہمارے نظام شمسی کے اس 9 ویں سیارے کو اب بونا سیارہ (Dwarf Planet) کہا جاتا ہے۔ اس سیارے کا نام پلوٹو ایک گیارہ سالہ بچی نے رکھا تھا جس کا نام "Ventia Phair" تھا۔ اس کا تعلق برطانیہ سے تھا۔ اس کی فیملی میں ایک پروفیسر نے بچی سے مشورہ کے بعد نئے دریافت ہونے والے سیارے کا نام 14 مارچ



ابن خلدون

ابن خلدون کو دنیا بحیثیت مورخ، فقیہ، فلسفی اور سیاست دان یاد کرتی ہے۔ آپ کا اصل نام ابو زید ولی الدین عبدالرحمن ابن خلدون تھا۔ آپ 27 مئی 1332ء کو تیونس میں پیدا ہوئے۔ آپ



سوشیالوجی اور اکنامکس کے بھی ماہر تھے۔ آپ کی وجہ شہرت مشہور کتاب مقدمہ ابن خلدون ہے۔ آپ کے بھائی یحییٰ ابن خلدون بھی معروف تاریخ دان تھے۔ آپ نے کم عمری میں قرآن، فقہ، عربی زبان، لسانیات میں مہارت حاصل کر لی۔ صرف 20 برس کی عمر میں سیاست شروع کی۔ شہرت کی دیوی مہربان ہوئی اور عرب ریاستوں میں آپ کی علمیت کا ڈنکا بجنے لگا۔ 1349ء میں آپ کے والدین طاعون کی بیماری سے وفات پا گئے۔ سرکاری نوکری

1930ء کو پلوٹو رکھا۔

شائع ہوا۔ نیوزی لینڈ کی آرمی اور کرکٹ ٹیم کو "Kiwis" کہا جاتا ہے۔

کیوی

بانس

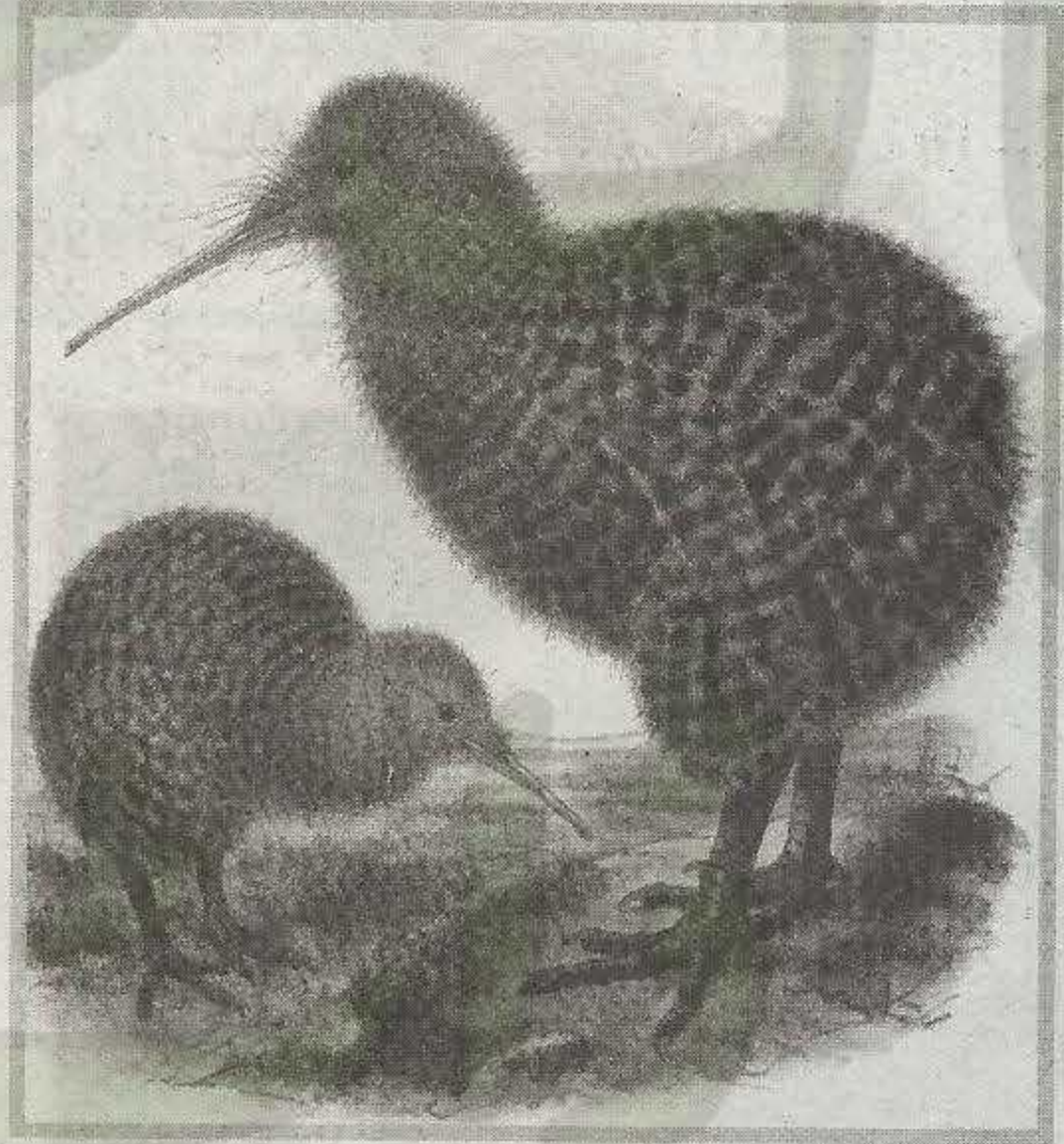
بانس یا "Bamboo" ایک سدا بہار پودا ہے۔ اس کا خاندان گھاس کا خاندان ہے جسے "Poaleae" کہا جاتا ہے۔ یہ اس خاندان کا سب سے بڑا پودا ہے۔ یہ بطور مضبوط تعمیراتی



میٹرل استعمال ہوتا ہے۔ یہ زمین پر تیزی سے بڑھنے والا پودا ہے۔ یہ ایک دن (24 گھنٹے) میں 250 سینٹی میٹر (98 انچ) بڑھتا ہے، اگر موسم اور مٹی سازگار ہوں۔ اس کی کچھ اقسام 30 میٹر (98 فٹ) بلند اور ان کا قطر یا ڈایا میٹر 15 سے 20 سینٹی میٹر (5.9 سے 7.9 انچ) ہوتا ہے۔ ان کی کچھ اقسام 65 سے 120 سال میں پھول پیدا کرتی ہیں۔ پانڈا بڑے شوق سے بانس کے پتے کھاتا ہے جب کہ چوہے اس کے پھل کو پسند کرتے ہیں۔ ان کی کچھ اقسام باڑ لگانے اور بحیثیت زیبائشی پودے اگائی جاتی ہیں۔ تھائی لینڈ کے لوگ اسے خوش قسمتی کا پودا سمجھتے ہیں۔ بانس مختلف ادویات اور کاغذ کی تیاری میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اردو ادب میں "اٹلے بانس بریلی کو" ایک مشہور محاورہ بھی ہے!

☆.....

کیوی (Kiwi) نیوزی لینڈ کا مقامی پرندہ ہے جو اڑ نہیں سکتا۔ اس کا سائنسی نام "Apteryx" ہے۔ اس کا تعلق کلاس "Aves" سے ہے۔ اس کی 5 اقسام پائی جاتی ہیں۔ اس جانور کا سائنسی نام یونانی زبان سے لیا گیا ہے جس کا مطلب ہے "بغیر پروں والا" کیوں کہ یہ پرندہ بھاگتا ہے۔ کیوی کی سب سے بڑی نوع (Species) کا نام "Great Spotted Kiwi" ہے جو کھڑا ہو تو اس کی بلندی 45 سینٹی میٹر (18 انچ) ہوتی ہے۔ ان



کا اوسط وزن 3.3 کلو گرام تک ہوتا ہے۔ ان کے بھورے پروں پر ہلکے دھبے ہوتے ہیں۔ مادہ انڈے دیتی ہے۔ نر اور مادہ انڈوں پر بیٹھ کر انہیں سیتے ہیں۔ کیوی شرمیلا جانور ہے اور یہ اکثر رات کو باہر نکلتا ہے۔ یہ حشرات، بچ، پتے وغیرہ کھا کر گزارہ کرتا ہے۔ سنڈیاں اس کی مرغوب غذا ہے۔ ان کے انڈے سائز میں خاصے بڑے ہوتے ہیں جن کا رنگ سفید مائل سبز ہوتا ہے۔ تقریباً 63 سے 92 دنوں میں انڈوں سے بچے نکل آتے ہیں۔ کیوی کا نشان نیوزی لینڈ کی آرمی رجمنٹ کے Badges پر بنا ہوتا ہے۔ اس جانور کی تصویر والا ڈاک ٹکٹ بھی 1898ء میں نیوزی لینڈ میں



معلومات عامہ

- قرآن پاک کے پہلے انگریزی مترجم مولوی محمد علی تھے۔
- قرآن پاک کا اردو ترجمہ ”موضح القرآن“ کے نام سے شاہ عبدالقادر نے کیا۔
- الفانسو کے حکم سے قرآن کا ترجمہ اسپینی زبان میں کیا گیا۔
- قرآن پاک کا سندھی زبان میں پہلا اور واحد منظوم ترجمہ مولوی احمد ملاح نے کیا۔
- قرآن پاک کے اولین حافظ حضرت عثمان غنیؓ تھے۔
- فیضی نے فارسی زبان میں قرآن کی بے نقطہ تفسیر لکھی۔
- سید جمال الدین افغانی کی کوششوں سے قرآن کا ترجمہ فارسی زبان میں ہوا۔ (شمرہ بخاری، لاہور)
- نظام شمسی کے سیاروں میں سب سے ٹھنڈا سیارہ پلوٹو ہے۔
- سب سے چمک دار ستارہ سیریس اے ہے۔
- خلا میں جانے والا پہلا انسان گیارین تھا۔
- ستارہ خود چمکتا ہے لیکن سیارہ ستارے کی روشنی سے چمکتا ہے۔
- مشہور یونانی اینکسا گورس نے سب سے پہلے اس نظریہ کی تردید کی کہ سورج دیوتا ہے۔
- رومر نے قانون بنایا تھا کہ روشنی سفر کرتی ہے۔
- تھیلیز نے بتایا تھا کہ زمین گول ہے۔
- قطبی ستارہ اپنی سمت تبدیل نہیں کرتا۔
- پیمائش ارضی یعنی زمین کا علم، جیومیٹری کہلاتا ہے۔ (امجد ثاقب، کوئٹہ)
- سلولائیڈ 75 درجے سینٹی گریڈ پر پلاسٹک بن جاتا ہے۔
- نمک کے تیزاب اور شوربے کے تیزاب کے آمیزے کو آب سلطانی کہتے ہیں۔
- آرسین ایک زہریلی گیس ہے۔ اسے عموماً جنگوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔
- آرسینک اور ہائیڈروجن کے باہمی امتزاج سے آرسین گیس بنتی ہے۔
- الفاریز زنگ سلفائیڈ سے ٹکراتی ہیں تو وہ چیز چمک اٹھتی ہے۔
- سیلیکون پلاسٹک پر پانی کا اثر نہیں ہوتا۔
- مصنوعی ہیرا سب سے پہلے سائنس دان ہنری موئیزان نے بنایا تھا۔
- ہیرے میں کاربن کا عنصر سب سے زیادہ ہوتا ہے۔
- سب سے زیادہ پارہ اسپین میں پایا جاتا ہے۔
- گریفائیٹ کو سیاہ سیسہ (Black Led) کہا جاتا ہے۔
- بناستی گھی میں ہائیڈروجن گیس استعمال ہوتی ہے۔ (غل ہما، کراچی)
- اسلام آباد کی جامع مسجد کا نقشہ ودات والون، ترکی نے بنایا تھا۔
- پاکستان میں پہلی مرتبہ قومی ترانہ حفیظ جالندھری کی آواز میں نشر ہوا۔
- دریائے سندھ کا دوسرا نام اباسین ہے۔
- پاکستان کا پرچم سب سے پہلے فرانس میں لہرایا گیا۔
- پاکستان اور ایران کا سرحدی علاقہ قلعہ سفید کہلاتا ہے۔
- پاکستان میں زمرہ کی کانیں سوات میں ہیں۔
- کوہ سفید پر درہ خیبر واقع ہے۔ (ام فاطمہ، ساہی وال)
- جرمنی کے شہر کولون کو ماہرین آثار قدیمہ کی جنت کہا جاتا ہے۔
- مراکش کے شہر کیسابلانکا کا نام ہسپانوی زبان کا لفظ ہے اس کا مطلب ہے سفید گھر۔
- دنیا کے قدیم ترین فصیل نما شہر کا نام اریجا (فلسطین) ہے۔
- کلید بند افغانستان کے شہر ہرات کو کہا جاتا ہے۔
- جنوب کا وینس یورپ کے شہر ایسٹرڈم کو کہا جاتا ہے۔
- بگ اپیل متحدہ ریاست ہائے امریکہ کے شہر نیویارک کو کہا جاتا ہے۔ (لوئس جی، ایبورا)

سر پہ کھڑا



کہنے لگی مئے کی ماں
میرے جگر اے میری جاں
اب چھوڑ بھی یہ شوخیاں
سر پہ کھڑا ہے امتحاں

اسکول سے تم آئے ہو
بستہ کہاں چھوڑ آئے ہو
اور ہاتھ میں بلا لیے
اس وقت جاتے ہو کہاں

انگلش تجھے آتی نہیں
اُردو تمہیں بھاتی نہیں
محنت پناں منزل کہاں
کیوں کر کروں تجھ سے بیاں

کس کام سے آیا ہے تُو
کیا کچھ سمجھ پایا ہے تُو
یہ زندگی ہے امتحاں
میرے جگر اے میری جاں



محمد بشیر

اگر امتحان

جب تُو بڑا ہو جائے گا
نکتہ سمجھ پھر پائے گا
غفلت سے جو کچھ کھو دیا
وہ ہاتھ آئے پھر کہاں



نیکی کا خوگر بن جا تُو
بے بس کی خاطر تن جا تُو
جنت تیرا مقام ہے
آئی صدا از لا مکاں

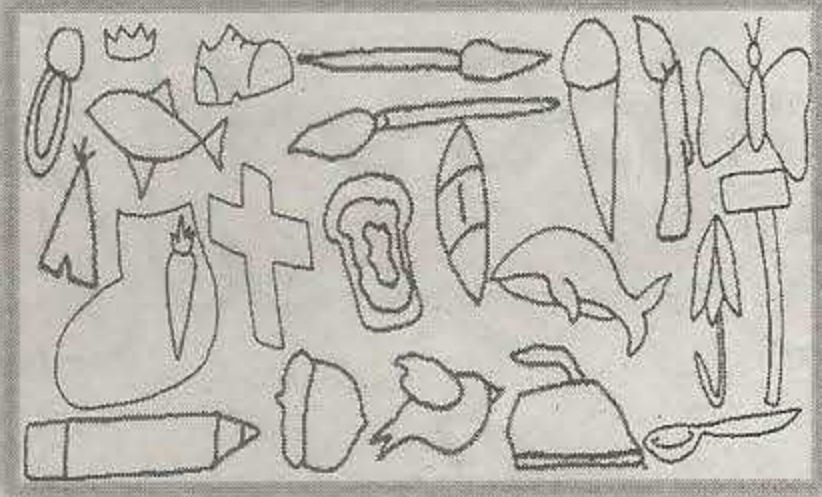
اِس دہر کی ہریالیاں
ہر سو پنپنے والیاں
کچھ گوریاں کچھ کالیاں
ڈھونڈا مگر پاؤں کہاں



اُوپر نظر تُو کر ذرا
اُس کی پکڑ سے ڈر ذرا
اُس کی نگاہِ ناز سے
ہے زندگی رواں دواں



میر راہی



یہ چیزیں خاکے میں چھپی ہوئی ہیں۔ آپ ان چیزوں کو تلاش کیجئے اور شاباش لیجئے۔





نوکر وہی جو آپ نے کہا، سائیکل کا پیڈل۔ (جواد اعجاز، صوابی)

ایک بینک میں ڈاکو کرنسی اور سونا لوٹ رہے تھے، ان کا ایک ساتھی گھبرایا ہوا تیزی سے اندر آیا اور کہا:

غضب ہو گیا، جو کارہم نے بھاگنے کے لیے باہر کھڑی کی تھی، وہ کوئی چرا کے لے گیا ہے۔ (محمد حارث سعید، پورے والا)

عمران ایک حکیم کے پاس گیا اور کہنے لگا: حکیم صاحب میرے پیٹ میں درد ہے۔

حکیم صاحب: آج تم نے کیا کھایا ہے؟

عمران: جلی ہوئی روٹی۔

حکیم صاحب نے اس کی آنکھوں کا علاج شروع کر دیا۔

عمران نے پوچھا: مگر میرے تو پیٹ میں درد ہے۔

حکیم صاحب: اگر تمہاری آنکھیں ٹھیک ہوتی تو تم جلی ہوئی روٹی نہ کھاتے۔ (محمد کلیم بھکر، حافظ آباد)

عدنان (ارم سے): تم پرندوں کے بارے میں کیا جانتے ہو؟

ارم: سب کچھ.....

عدنان: تو پھر بتاؤ، کون سے پرندے اڑ نہیں سکتے؟

ارم: مرے ہوئے پرندے!

☆.....

استاد (دو سگے بھائیوں سے): تم دونوں نے اپنے والد کا نام مختلف کیوں رکھا ہے؟

ایک بھائی: ایک جیسے لکھ دیتے تو آپ کہتے کہ تم نے نقل کی ہے۔

(زینب محمود، نوشہرہ ورکال)

ڈاکٹر: میں نے یادداشت تیز کرنے کے لیے دوا دی تھی اس سے کچھ فرق پڑا؟

مریض: ہاں! یہ فرق پڑا کہ مجھے یہ بات یاد رہتی ہے کہ میں کچھ بھول رہا ہوں۔

☆☆☆

جج (ملزم سے): تم نے اس گھر میں چوری کیوں کی؟

ملزم: جناب دروازے پر لکھا تھا۔ ”سنہری موقع“

(حراسید شاہ، جوہر آباد)

دو پاگل آپس میں بات کر رہے تھے۔ ایک پاگل بولا:

یار کل میں مر گیا تھا۔ تم میرے جنازے میں کیوں نہیں آئے۔

دوسرا پاگل: یار تم بھی کمال کرتے ہو، میں کل ہی پیدا ہوا تھا۔

(حانیہ رضا)

ایک دن احمد صاحب نے اپنے نوکر سے کہا کہ کسی کا نام لینے سے

پہلے صاحب یا صاحبہ کہا کرو۔ ایک دن ان کا نوکر بھاگا بھاگا آیا اور

کہا: صاحب جی! بلی صاحبہ، مرغی صاحبہ کو کھا گئی ہیں اور مرغی

صاحبہ نہیں مل رہی۔ (زارا وہاب، اسلام آباد)

استانی (بچے سے): یقین اور وہم میں کیا فرق ہے؟

بچہ: ٹیچر آپ پڑھا رہی ہیں تو یہ آپ کا یقین ہے اور اگر آپ یہ سمجھ

رہی ہیں کہ ہم پڑھ رہے ہیں تو یہ آپ کا وہم ہے۔

(جویریہ یونس، لاہور)

دادی: تمہاری ٹیچر آ رہی ہیں، تم چھپ جاؤ۔

پوتا: پہلے آپ چھپ جائیں کیوں کہ میں آپ کی وفات کی وجہ سے

تین دن کی چھٹی پر ہوں۔ (محمد سعد انور، احمد پور شرقیہ)

استاد: میں نے تمہیں کتنی مرتبہ کہا ہے کہ سبق یاد کیا کرو۔

شاگرد: جناب تین مرتبہ.....! ☆☆☆

جج (ملزم سے): تم نے دن دہاڑے چوری کیوں کی تھی.....؟

ملزم: کیا کرتا حضور! رات کو مجھے نیند آ جاتی ہے۔

(کشف جاوید، فیصل آباد)

مالک (نوکر سے): جاؤ اندر سے انسائیکلو پیڈیا لاؤ۔

نوکر تھوڑی دیر بعد آ کر بولا: یہ لیجئے مالک!

مالک: ارے! یہ کیا اٹھا لائے ہو؟



منور جہاں خورشید



چرخہ

سامان اور وزن:

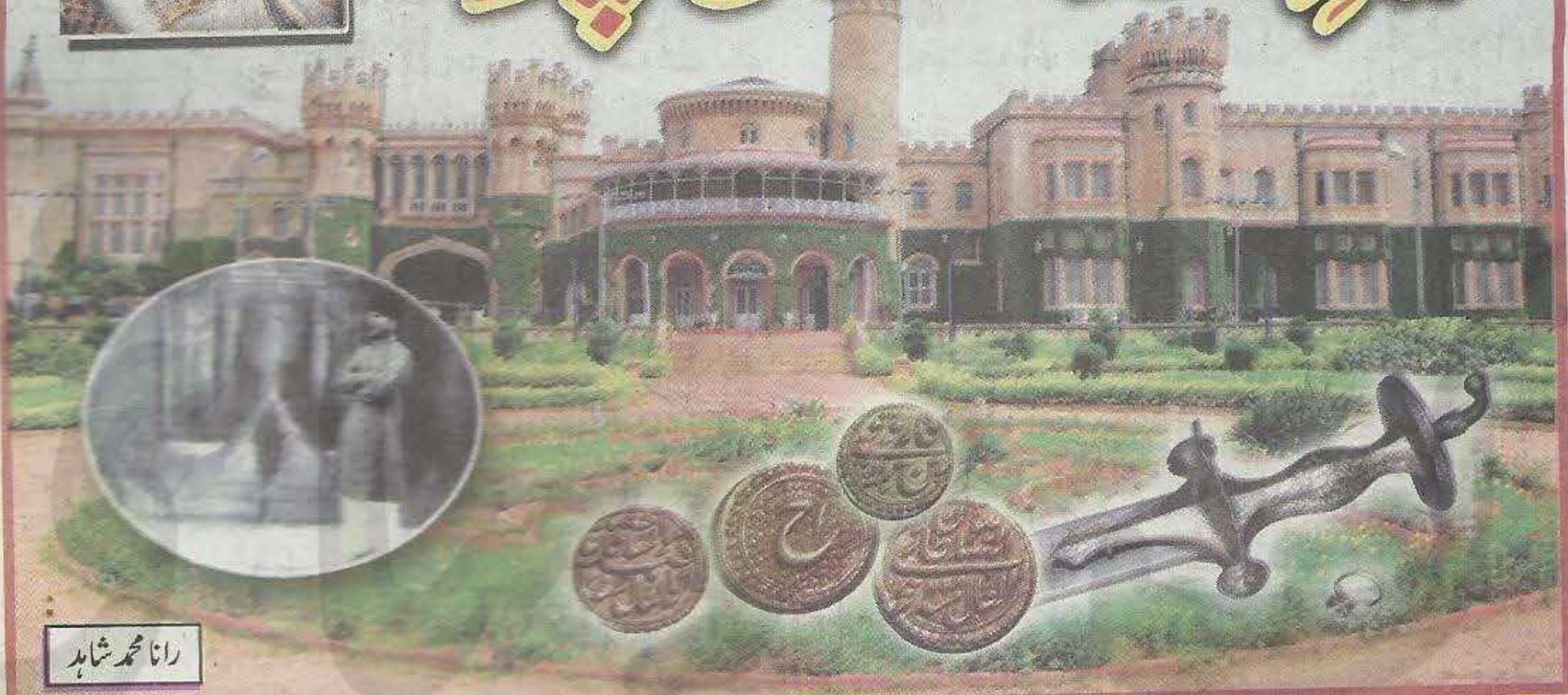
مرغی (ثابت)	دو کلو گرام	لال مرچ	حسب ذائقہ
نمک	حسب ذائقہ	لیموں	دو عدد بڑے
اورک پس ہوئی	ایک چائے کا چمچ	پیاز	ایک پس ہوئی
دہی	ایک پاؤ	گھی	ایک پاؤ
زیرہ پسا ہوا	ایک چٹکی	دارچینی	ایک ٹکڑا
لونگیں	چار عدد	الائیچی	چار عدد
کالی مرچ	بارہ دانے		

ترکیب:

مرغی کو کانٹے سے گود لیں۔ نمک، لال مرچ اور لہسن پیس کر لیموں کے رس میں ملا دیں۔ پھر اس کو مرغی پر اچھی طرح مل دیں اور چند گھنٹے پڑا رہنے دیں۔ دہی پھینٹ لیں۔ اورک، زیرہ، دارچینی، لونگیں، الائیچی، پیاز اور کالی مرچ اچھی طرح پیس کر دہی میں ملا دیں۔ دہی کو مرغی پر اچھی طرح مل دیں، حتیٰ کہ جذب ہو جائے۔ اب مرغی کو اوون میں رکھ دیں۔ پانی خشک ہو جائے تو اس پر گھی مل دیں اور روسٹ کرتے جائیں۔ یہاں تک کہ مرغی گل جائے۔ (روسٹ بھاری پینڈے کی دیگچی میں بھی ہو سکتا ہے جس کا منہ ڈھکن سے بند کر دیا جائے۔ لوہے کی سیخ پر لگا کر آہستہ آہستہ ہلاتے رہنے سے بھی روسٹ ہو جاتا ہے) جب دہی خشک ہو جائے تو اور مل کر تر کر لیا جائے، حتیٰ کہ تمام دہی جذب ہو جائے۔ روسٹ کے لیے ہلکی آنچ ضروری ہے۔ جب دہی کی نمی ختم ہو جائے تو گھی چھڑکتے رہنا چاہیے۔ گھی اور دہی اس طرح لگایا جائے کہ نیچے نہ گرے۔ تیار ہو جائے تو ڈش میں رکھ دیا جائے۔ اس کے ارد گرد سلاد کے پتے، ہرا دھنیا، ہرا پودینہ، ٹماٹر کے قتلے، ہری مرچیں، ابلے ہوئے انڈوں کے قتلے، گاجر کے قتلے، مولیٰ کے قتلے، گو بھی کے پھول (ابلے ہوئے) اور آلو (تلے ہوئے) رکھ کر کھانے کو پیش کریں۔



شیر میسور سلطان پٹو



رانا محمد شاہد

انہوں نے اپنے بیٹے ٹیپو سلطان کے ذریعے دور کرنے کا عہد کیا۔ حیدر علی کی طرح ٹیپو سلطان بھی بہت سی خدا داد صلاحیتوں کے مالک تھے۔ باپ نے سب سے پہلے بیٹے کو مذہبی تعلیم سے روشناس کرایا۔ اس وقت کے مشہور علماء سے مذہبی تعلیم حاصل کی۔ بعد میں چند علاقائی و غیر ملکی زبانوں میں بھی تعلیم حاصل کی۔ انہوں نے اردو، فارسی، تامل، مرہٹی، فرانسیسی اور انگلش زبانیں بھی سیکھیں۔ ذرا بڑے ہوئے تو آپ کے والد نے انہیں تیراندازی، نیزہ بازی، تیراکی، تلوار زنی، بندوق، توپ، گھر سواری، شکار اور خونی درندوں سے لڑنے جیسی فنی مہارتوں سے روشناس کرایا۔ حیدر علی نے بیٹے کی تربیت کے لیے اس وقت کے مشہور اور تجربہ کار جنگی ساز بازوں کی خدمات لیں جو اچھے جرنیل بھی تھے۔

باپ کی بیٹے کو ان جنگی مہارتوں کے سکھانے کے پیچھے اس واقعہ کا حوالہ بھی ضروری ہے جس کے مطابق ایک دن ٹیپو لاہیری میں بیٹھے مطالعہ کر رہے تھے کہ آپ کے والد اچانک لاہیری میں داخل ہوئے۔ بیٹے کو آنے کی خبر نہ تھی۔ باپ نے جب بیٹے کو مطالعہ میں مصروف دیکھا تو بہت خوش ہوئے، لیکن پھر کہا۔ ”میرے لخت جگر! نظام حکومت چلانے کے لیے صرف کتابیں ہی کافی نہیں بلکہ آپ کو اپنے ہاتھ میں تلوار بھی لینی ہے۔“ باپ کی اس نصیحت

بچے کی عمر چھ سات سال تھی۔ وہ باہر لڑکوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ اتنے میں وہاں سے ایک بزرگ کا گزر ہوا۔ انہوں نے اس بچے کو اپنے پاس بلایا اور کہا۔ ”بیٹا! تم بہت خوش نصیب بچے ہو کیوں کہ تم ایک دن میسور کے بادشاہ بنو گے، ان شاء اللہ! وعدہ کرو کہ اگر تم حکمران بنو گے تو اس جگہ پر ایک مسجد تعمیر کراؤ گے۔“ اس بچے نے جواب میں کہا۔ ”اللہ نے چاہا تو مسجد ضرور تعمیر کراؤں گا۔“ پھر جب وہ بچہ میسور کا حکمران بنا تو وہاں ایک مسجد بنوائی جس کا نام مسجد اعلیٰ رکھا گیا۔ یہ مسجد آج بھی پوری آب و تاب کے ساتھ وہاں موجود ہے۔

جی ہاں..... اس بچے کا نام ٹیپو سلطان تھا۔ ٹیپو سلطان 20 نومبر 1750ء کو دیون ہلی کے مقام پر پیدا ہوئے۔ ٹیپو سلطان کا نام ایک مجذوب بزرگ ٹیپو مستان کے نام کی مناسبت سے رکھا گیا۔ انہیں اپنے دادا کے نام ”فتح محمد“ کی مناسبت سے ”فتح علی“ بھی لکھا اور پکارا جاتا ہے۔ والد کا نام حیدر علی اور والدہ کا نام فخر النساء بیگم عرف فاطمہ تھا۔

آپ کے والد حیدر علی ناخواندہ تھے لیکن اس کے علاوہ ان میں بے شمار خوبیاں تھیں۔ غیر معمولی ذہانت کے ساتھ وہ تمام جنگی چالوں کے بھی ماہر تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ ایک معمولی عہدے سے ترقی کرتے ہوئے ایک ریاست کے حکمران بن گئے لیکن اس سب کے باوجود وہ خود میں تعلیم کی کمی محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ اس تشنگی کو

عورتیں بیٹھتی ہیں۔“ وہ اکثر گھڑ سواری کرتا اور کہتا کہ گھڑ سواری جوان مردوں کی سواری ہے اور شکار کھیلنا بھی۔ غرض کہ ٹیپو کی زندگی تن آسان حکمرانوں کی طرح نہیں بلکہ ہر لمحہ مشقت و جدوجہد میں گزری۔

مذہب سے ٹیپو سلطان کو خاص وابستگی تھی۔ جب انہوں نے میسور کی حکومت سنبھالی تو باضابطہ تخت شاہی پر بیٹھنے سے پہلے اپنی ماں کی خدمت میں حاضری دی، ان کی دعائیں لیں۔ دو رکعت نفل پڑھ کر اللہ سے امانت کو سنبھالنے کی ہمت و توفیق طلب کی اور دربار میں آ کر تخت پر بیٹھ گئے۔ دربار شاہی کی پہلی مجلس کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ قاری نے سورہ حشر کا آخری رکوع تلاوت کیا جس میں کہا گیا۔ ”اگر ہم یہ قرآن پہاڑ پر نازل کرتے تو تم دیکھتے کہ وہ اللہ کے خوف سے پھٹ جاتا۔۔۔۔۔“ اس پر بے اختیار ٹیپو کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ پوری مجلس پر سکتہ طاری رہا۔

ٹیپو سلطان نماز روزے کے پابند تھے۔ قرآن پاک کی تلاوت ان کا معمول تھا۔ اسلام سے بے حد محبت رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے عظیم الشان مسجد اعلیٰ تعمیر کروائی۔ اپنے ہر خط کے آخر میں اللہ کافی اور نبی مالک لکھتے۔ تمام مذاہب کا احترام کرتے اور ہر مذہب کے عالم کو بڑی قدر دیتے۔

ٹیپو سلطان خود دار تھا تو اس نے یہی صفات اپنی عوام میں پیدا کرنے کے لیے بھی اقدامات اٹھائے۔ حکمران بننے کے بعد آداب کے جو طریقے ہندوستان کی مسلمان فوج میں برسوں سے چلے آ رہے تھے، وہ رد کر دیے کیوں کہ وہ ان طریقوں کو انسان کی عزت نفس کے خلاف سمجھتے تھے۔ یعنی انہوں نے استقبال کے لیے اپنی جگہ سے اٹھنے اور ہاتھوں کو چومنے وغیرہ کو ختم کیا اور ہدایت کی کہ تمام مسلمان بھائی بھائی اور آپس میں برابر ہیں۔ اس لیے صرف السلام علیکم کہہ کر ایک دوسرے کا استقبال کریں۔ یہ ایسے اقدامات تھے جن سے لوگوں میں خودی اور خود داری جیسی صفات پیدا ہوئیں۔ آپ فرقہ پرستی کے سخت خلاف تھے۔ ملکی نظم و نسق خراب کرنے والوں کو سخت سزائیں دیتے۔ آپ منافقت سے سخت نفرت کرتے اور ہمیشہ سچی اور کھری بات کرتے۔ دوست اور دشمن کی پہچان رکھتے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ انگریزوں کی چال بازیوں اور مکاریوں کو سب سے پہلے انہوں نے ہی پہچانا اور ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ آپ نے اپنے دور حکومت میں زراعت کو سائنسی بنیادوں پر فروغ

نے بیٹے کی زندگی کا رخ موڑ دیا۔ پھر وہ قلم کے ساتھ ساتھ میدان کا بھی غازی بن گیا۔ انہوں نے صرف 15 سال کی عمر میں ہی جنگوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔

ٹیپو سلطان میں بچپن ہی سے ایسی خصوصیات تھیں جن کے ہوتے ہوئے کوئی بڑا آدمی بنتا ہے۔ وہ والدین کا بہت احترام کرتے تھے۔ مورخین کے مطابق ایک مرتبہ وہ اپنی والدہ سے ملنے گئے۔ دوپہر کا وقت تھا، والدہ آرام فرما رہی تھیں۔ آپ کچھ دیر محل میں انتظار کرتے رہے مگر ملاقات نہ ہو سکی۔ اسی دوران آپ کی آنکھ لگ گئی۔ حرم کی چند خواتین نے بطور ہمدردی اور تھکا ہوا بچہ سمجھ کر آپ کو دوبانا شروع کر دیا۔ آپ فوراً پیچھے ہٹے اور انہیں کہا کہ آپ میری ماں کے برابر ہیں، لہذا میں آپ کی ایسے ہی عزت کرتا ہوں جیسے اپنی ماں کی، آپ ایسا نہ کریں۔

آپ شرم و حیا کا پیکر تھے۔ والدہ بچپن میں ہمیشہ کپڑا اوڑھا کر غسل کرواتیں۔ شاید بچپن کی اس تربیت کا اثر تھا کہ یہی بچہ بڑا ہو کر نہ صرف ایک غیرت مند حکمران بنا بلکہ بے پردگی کا مکمل خاتمہ بھی کر دیا۔

1782ء میں ٹیپو سلطان کے والد حیدر علی کا انتقال ہوا تو آپ ریاست میسور (کرناٹک) کے حکمران بنے۔ عنان حکومت سنبھالنے کے بعد ٹیپو سلطان نے اپنی رعایا کے نام پہلا سرکاری فرمان جاری کیا جس میں رعایا کی خدمت کے جذبات اور حسن نیت و ہمدردی کی عکاسی کی گئی۔ فرمان میں لکھا گیا۔

”میں ٹیپو سلطان بحیثیت حکمران ریاست میسور سلطنت خدا داد اس بات کو اپنا فرض منصبی سمجھتا ہوں کہ بلا تفریق مذہب و ملت اپنی رعایا کی اخلاقی اصلاح کروں گا۔“

ٹیپو سلطان بڑا خود دار حکمران تھا۔ وہ نہ صرف اپنے ملک کی چیزیں استعمال کرتا بلکہ عوام کو بھی اپنے ملک کی اشیاء استعمال کرنے کی تلقین کرتا اور کہتا کہ ہمیں اپنے ملک کی چیزوں پر فخر ہونا چاہیے۔ انگریزوں کے خلاف جہاد کے لیے جو اسلحہ و گولا بارود استعمال کیا جاتا، وہ اپنے ہی ملک میں تیار کراتا۔ انہوں نے اپنے ملک میں جنگی ساز و سامان بنانے کے کارخانے قائم کیے۔ ان کارخانوں میں جنگی ساز و سامان تیار کیا جاتا جو کسی بھی طرح انگریزوں کے اسلحے سے معیار میں کم نہ ہوتا۔

ٹیپو سلطان سبھی راجاؤں، نوابوں کی طرح پاکی وغیرہ میں بیٹھنا پسند نہیں کرتا تھا اور کہتا تھا۔ ”پاکی میں بیمار، لاچار، کمزور، بوڑھے اور

دیا اور تجارت کے کاروبار کو بھی وسعت دی۔ دوستوں کے پکے دوست تھے۔ یہی وجہ تھی کہ میسور کی آخری جنگ جب لڑی جا رہی تھی تو اس دن قلعہ میں فرانس کے سوا آدمی موجود تھے۔ آپ نے ان کی حفاظت کو مقدم رکھا اور خود شہید ہو گئے۔

کہا جاتا ہے کہ جب ٹیپو سلطان انگریزوں کو شکست پہ شکست دیتا گیا تو انہوں نے ایک انگریز کو صوفی بزرگ کے لباس میں میسور بھیجا جس نے ٹیپو سلطان کے قریبی ساتھیوں کو لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا۔ ان غداروں میں میر صادق، میر غلام نبی، میر قاسم علی اور دیوان پورنیا نمایاں ہیں جب کہ ہندو مرہٹے اور نظام دکن پہلے ہی انگریزوں سے مل چکے تھے۔

ٹیپو سلطان انگریزوں کے راستے کی ایک ایسی دیوار بن گیا تھا جسے گرانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو گیا تھا مگر یہ اپنوں کی غداری تھی کہ جس نے سرنگا پٹم کی خاک کو لہو سے سرخ کر دیا۔ ٹیپو سلطان جب انگریزوں کے لیے ناقابل شکست پہاڑ بن گیا تو پھر انگریزوں کو غداروں کی مدد لینا پڑی اور غداروں کی مہربانی سے ٹیپو سلطان کے گرد گھیرا تنگ ہونا شروع ہوا۔

میسور کی چوتھی جنگ سے پہلے دو انگریز فوجی خندق پار کر کے سرنگا پٹم کے قلعے میں داخل ہوئے اور تمام قلعے کا سروے کرنے کے بعد واپس بھی چلے گئے۔ یوں قلعے کے اندرونی حالات کا علم ہونے کے بعد جنرل ہیرس نے فوری طور پر قلعے کے اندر داخلے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ 3 مئی 1799ء کو گولہ باری کے ذریعے انگریز فوج نے قلعے کی دیوار میں ایک شکاف ڈال دیا۔ 4 مئی کی صبح شیر میسور نے فجر کی نماز مسجد اعلیٰ میں ادا کی اور پھر قلعہ کی دیوار کے شکاف اور مرمت کا معائنہ کیا۔ 4 مئی کو تقریباً 3 ہزار فوجی، جو خندقوں میں چھپے بیٹھے تھے، نے حملہ کر دیا۔ جس شکاف سے یہ فوجی قلعے کے اندر داخل ہوئے، وہاں دفاعی انتظامات نہ ہونے کے برابر تھے کیوں کہ غدار میر صادق اور پورنیا نے باہمی ملی بھگت سے سپاہیوں کو یہ کہہ کر واپس بلا لیا تھا کہ فوراً آ کر اپنی تنخواہیں لے جاؤ۔ اب دشمن کی فوج بغیر کسی رکاوٹ کے قلعے کے اندر داخل ہو گئی مگر اس کے باوجود سلطان کی بہادر فوج نے ڈٹ کر دشمن کا مقابلہ کیا۔ چند حملہ آوروں کے علاوہ باقی سب مارے گئے۔

4 مئی کو دوپہر ایک بجے ٹیپو سلطان اپنی کمانڈ پوسٹ میں آم

کے درخت کے نیچے کھانا کھانے لگے۔ ابھی پہلا لقمہ ہی اٹھایا تھا کہ ایک گھڑسوار نے انہیں خبر دی کہ سید غفار جوان کے بہترین جرنیلوں میں سے ایک تھے، شکاف کے قریب گولا لگنے سے شہید ہو گئے ہیں۔ سید عبدالغفار کی شہادت کی خبر سنتے ہی ٹیپو سلطان نے لقمہ فوراً نیچے رکھ دیا اور کہا۔

”سید غفار ایک بہادر جرنیل تھے۔ وہ کبھی موت سے نہیں ڈرتے تھے۔ ہم بھی جلد انہیں جا ملیں گے۔“

انگریز فوج کے قلعے کے اندر داخل ہونے کی خبر سلطان کے لیے حیران کن تھی لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھے کہ غدار اپنا کام کر چکے ہیں۔ جب انہیں یقین ہو گیا تو کہا۔

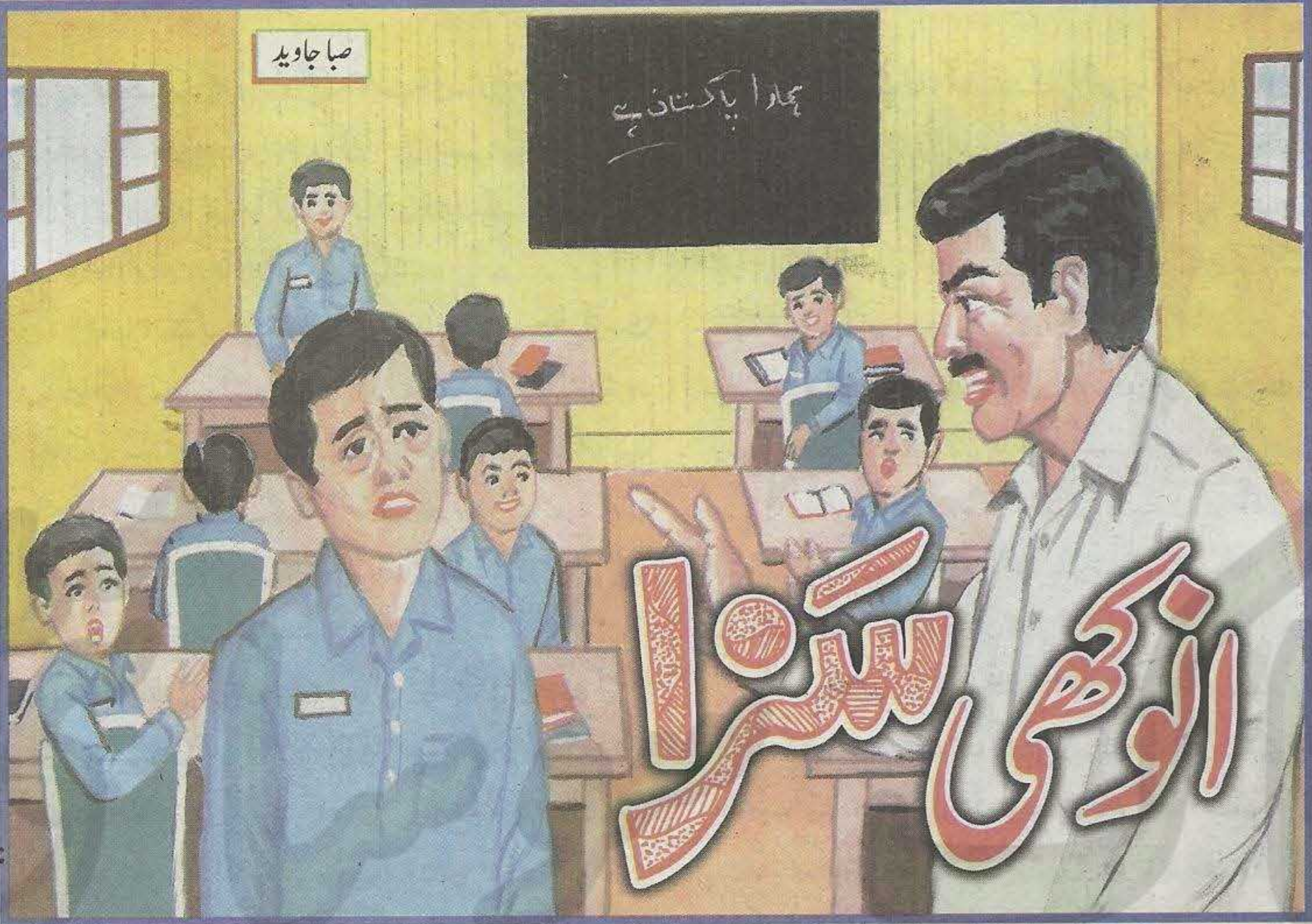
”اے غدارو! تم اپنے کام کا انجام ضرور دیکھو گے۔ تم اور تمہاری نسلیں ایک عرصے تک انگریزوں کے غلام رہیں گی۔ تم چاول کے ایک ایک دانے اور پیاز کی ایک ایک قاش کو ترسو گے۔“

یہ کہہ کر ٹیپو سلطان اپنے ساتھیوں کے ساتھ شکاف کی طرف حملہ آور فوج کا مقابلہ کرنے کے لیے آگے بڑھے۔ ایک موقع پر جب ٹیپو سلطان بڑی بہادری سے لڑ رہے تھے، ایک گولی لگنے سے زخمی ہو گئے۔ اس دوران انہوں نے کئی انگریز سپاہیوں کو ہلاک کیا۔ انگریز فوج کی تعداد بہت زیادہ تھی اور ایک مشکل وقت میں سلطان کے اے ڈی سی نے انہیں مشورہ دیا۔ ”سلطان معظم! اگر آپ خود کو دشمن کے حوالے کر دیں تو اس سے آپ کی جان بچ سکتی ہے۔ اس پر ٹیپو سلطان نے اپنا تاریخی فقرہ بولا۔

”میں گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی کو بہتر سمجھتا ہوں۔“

پھر وہ ایک نئے جوش و دلولے سے دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ اس دوران ایک گولی ٹیپو سلطان کی چھاتی کے بائیں جانب لگی جس سے وہ نیچے گر پڑے۔ ایک انگریز سپاہی ان کی سونے کی پیٹی اتارنے کے لیے آگے بڑھا تو سلطان نے نیم بے ہوشی کے عالم میں اس پر ایسا وار کیا کہ حریص انگریز وہیں ہلاک ہو گیا۔ عین اس وقت جب سورج غروب ہو رہا تھا، میسور کا یہ آفتاب سرنگا پٹم پر حسرت بھری نگاہیں ڈالتا ہوا ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ علامہ اقبال نے اپنی شاعری میں جس مرد مومن اور مرد آہن کا تذکرہ کیا ہے، وہ ٹیپو سلطان کی شخصیت سے متاثر ہو کر کیا ہے۔

☆☆



رہا تھا کیوں کہ آج ہوم ورک جو نہیں کرنا تھا۔ دوسرے دن امی جان نے صبح ہی صبح علی کو جگایا اور وقت پر اسکول بھجوایا۔

پچھلے دن اسکول سے غیر حاضر ہونے کی وجہ سے علی کو سزا کے طور پر دس بار ایک ہی سبق لکھ کر لانے کو دیا گیا۔ اسکول سے واپسی پر اسکول بیگ اپنے کمرے میں رکھ کر باہر آیا تو ڈرائنگ روم سے باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں، علی وہیں چلا گیا۔ امی جان، ماموں اور ممانی جان کے ساتھ باتیں کر رہی تھیں۔ دانیال اور سیمی، مانو کے ساتھ کھیل رہے تھے، علی کو دیکھا تو خوشی سے اچھلنے لگے۔ علی، ماموں ممانی کے ساتھ ملا اور تینوں گھر میں اودھم مچانے لگے۔ امی جان نے علی کے لیے کھانا لگایا اور اسے کھانے پر بلایا لیکن وہ تو کھیلنے میں مصروف تھا۔ ان کے بہت زیادہ بلانے پر آیا اور چند لقمے لے کر پھر کھیلنے چلا گیا۔ امی جان اسے ہوم ورک کروانے کے لیے بلاتی رہیں لیکن وہ ”امی جان ابھی آیا“ کہہ کر کھیلتا رہا۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد ابو جان نے بھی اسے ہوم ورک کرنے کو کہا لیکن وہ تو دانیال اور سیمی کے ساتھ اپنا پسندیدہ ٹی وی شو دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ رات نو بجے بجلی چلی گئی تو وہ لوگ سونے چلے

علی نے آج اسکول نہ جانے کا پکا ارادہ کیا ہوا تھا۔ صبح جب امی جان جگانے کے لیے آئیں تو دو تین آوازیں دینے پر بھی نہ جاگا۔ ”اچھا امی جان اٹھ رہا ہوں“ کہہ کر دوبارہ گرم لحاف کے اندر منہ دے کر سو گیا۔ امی جان واپس چلی گئیں۔ انہوں نے ابھی فجر کی نماز بھی پڑھنی تھی اور ناشتہ بھی بنانا تھا۔ علی مزے سے سویا رہا۔ ابو جان نماز پڑھ کر واپس آئے اور ناشتہ طلب کیا۔ ناشتہ کی میز پر علی کو نہ پا کر انہوں نے اس کے بارے میں پوچھا اور خود اسے جگانے چلے گئے۔ اسے اٹھا کر باتھ روم میں بھجوایا اور خود باہر آ کر اس کا انتظار کرنے لگے۔ علی نے آہستہ سے ہاتھ دھوئے اور کافی دیر کے بعد باہر آیا اور ان کے ساتھ ناشتہ کرنے لگا۔ ابو جان ناشتہ کرنے کے بعد دفتر چلے گئے۔ اتنے میں اسکول وین آئی اور دو تین بار ہارن بجانے کے بعد چلی گئی۔ علی کو تو اسکول نہ جانے کا بہانہ مل گیا۔ وہ ضد کرنے لگا کہ وین چلی گئی ہے، اب وہ اسکول نہیں جائے گا۔ امی جان نے بھی زیادہ سختی کرنا مناسب نہ سمجھا اور چھٹی کرنے کی اجازت دے دی۔

علی دن بھر مزے سے کھیلتا رہا۔ آج تو وہ لاپرواہی سے کھیل

جان کی موجودگی میں اپنی مشکوک سرگرمیاں جاری نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس نے ایک فیکٹری میں نوکری اختیار کر لی۔ اس دن ابو جان بہت اداس تھے اور اداس کیسے نہ ہوتے، ان کے سارے خواب کرچی کرچی جو ہو گئے تھے۔ انہوں نے تو اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے افسری کے خواب دیکھے تھے لیکن اب جو ہو گیا سو ہو گیا۔ صبر ہی پر اکتفا کیا گیا۔

علی کو اب بھی کوئی پچھتاوا نہیں تھا۔ وہ صحیح معنوں میں نافرمان اولاد بن چکا تھا۔ علی دن کو جو کچھ کماتا، شام کو بُرے دوستوں کے ساتھ مل بیٹھ کر نشہ کر لیتا۔ گھر والوں کی روک ٹوک کا اس پر کوئی اثر نہیں تھا۔ نشے کے اثر سے وہ کام پر بھی کم ہی جانے لگا اور اس کی صحت پر بھی بُرا اثر پڑنے لگا۔ کام پر نہ جانے اور پیسے نہ ملنے کی وجہ سے اب اسے نشہ بھی کم ملنے لگا۔ آہستہ آہستہ اس نے گھر کی چیزیں چرا کر بیچنی شروع کر دیں اور نشہ پورا کرنے لگا لیکن جلد ہی گھر والوں کو خبر ہو گئی اور اس کے سارے راستے بند ہو گئے۔ اس کی حالت بہت زیادہ بگڑ گئی۔ وہ بستر پر پڑا ہر وقت کھانستا رہتا اور گالیاں بکتا رہتا۔ آخر اس کے

گئے۔ علی جب صبح اٹھا تو اب اسے فکر ہو رہی تھی کہ نہ تو اس نے ہوم ورک کیا ہے اور نہ ہی سزا کے طور پر دیا ہوا سبق۔ آج علی کو ہوم ورک نہ کر کے لانے پر کلاس سے باہر نکال دیا گیا۔ وہ تو علی کی قسمت اچھی تھی کہ اس کے انگریزی کے استاد جنہوں نے سزا میں سبق لکھ کر لانے کو دیا ہوا تھا، اسکول سے غیر حاضر تھے، نہیں تو علی کو آج پرنسپل صاحب کے روبرو پیش ہونا پڑتا۔

اسی طرح دن گزر گئے۔ علی کا دل پڑھائی سے اچاٹ ہوتا گیا۔ علی کلاس ہشتم کا طالب علم تھا۔ جب اس کا رزلٹ آیا تو وہ انتہائی کم نمبروں سے پاس ہوا تھا۔ ابو جان نے اسے کلاس نہم میں داخل کروا دیا اور ساتھ ہی سخت الفاظ میں تنبیہ کی کہ اب وہ اپنی تمام فالتو سرگرمیاں ترک کر دے اور پڑھائی پر توجہ دے تاکہ میٹرک میں اچھے نمبر لینے کے بعد کسی اچھے کالج میں اسے داخلہ مل سکے۔

عادت جو پختہ ہو جائے وہ کب چھوٹی ہے، علی نے بھی ابو جان کی نصیحت کو سنا اور زیادہ دیر اس پر عمل نہ کر سکا۔ آہستہ آہستہ وہ پھر سے اپنے دل پسند مشغلے میں بُری طرح مشغول ہو گیا۔ ابو جان کے پاس مصروفیت کے باعث اتنا وقت نہیں ہوتا تھا کہ وہ علی

کی روزانہ کی رپورٹ چیک کرتے اور اس پر توجہ دیتے۔ کبھی کبھار چھٹی والے دن وہ اس سے پڑھائی کے متعلق پوچھ لیتے تو وہ انہیں مطمئن کر دیتا۔ دن اسی طرح گزرتے رہے اور دو سالوں کا پتا ہی نہیں چلا۔ علی کی غلط عادات میں بہتری کے بجائے پختگی آتی گئی۔ اس نے میٹرک کا امتحان دیا۔ جب رزلٹ آیا تو علی ڈی گریڈ کے ساتھ بمشکل پاس ہو سکا تھا۔ اس کے نمبراتنے اچھے نہیں تھے کہ وہ کسی اچھے کالج میں داخلہ لے سکتا اور نہ ہی علی کا آگے پڑھائی جاری رکھنے کا کوئی ارادہ تھا۔ اس نے اپنے اس ارادے سے ابو جان کو بھی آگاہ کر دیا۔ ابو جان نے اسے اپنے ساتھ دفتر لے جانا چاہا تو اس نے وہاں جانے سے بھی صاف انکار کر دیا۔ ظاہر ہے وہ وہاں ابو



والدین کو پھر اس پر ترس آیا۔ آخر کو تھا تو ان ہی کی اولاد۔ وہ اسے اس طرح مرتا ہوا کیسے دیکھ سکتے تھے۔

ابو جان نے علی کو ایک اسپتال میں داخل کروا دیا۔ وہاں پر اس کا باقاعدگی سے علاج ہوتا رہا۔ بظاہر اس کی حالت رفتہ رفتہ بہتر ہونے لگی اور وہ ہوش کی دنیا میں آنے لگا۔

اسپتال میں ایک دن علی نے ایک خوبرونو جوان کو دیکھا جو اپنی ظاہری شخصیت اور چال چلن سے ڈاکٹر لگتا تھا۔

وہ ہر مریض کے پاس جاتا اور نرم و شگفتہ لہجے میں ہر ایک کی خیریت دریافت کرتا۔ اس نے علی سے بھی اسی میٹھے اور شگفتہ انداز میں بات کی۔ اس کے انداز سے لگتا تھا کہ اس نے علی کو پہچانا نہیں لیکن علی اسے پہچان گیا تھا۔

یہ وہی شخص تھا جو علی کے ساتھ پڑھتا تھا اور محلے کے نائی کا بیٹا تھا۔ علی اور اس کے دوست اپنی دولت اور خاندانی اثر و رسوخ کا گھمنڈ لیے روزانہ عابد کو چھیڑتے اور تنگ کرتے۔ عابد اسکول سے واپسی پر اپنے باپ کے ساتھ دکان میں چھوٹے موٹے کام کرواتا۔ کبھی غلطی کی صورت میں جب اس کا باپ اس کی پٹائی کرتا تو یہ لوگ کھڑے ہو کر تماشا دیکھتے، ہنستے اور خوب قہقہے لگاتے۔ آخر وہ بھی انسان تھا، کب تک برداشت کرتا۔ اس نے ان کی باتوں کا جواب دینا چاہا لیکن زبان سے ان کی باتوں کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔ وہ انہیں مکمل جواب دینا چاہتا تھا۔ اس نے بھرپور محنت شروع کر دی۔ میٹرک میں عابد نے اے پلس گریڈ حاصل کیا اور وظیفے کے بل بوتے پر شہر کے بہترین کالج میں داخلہ لے لیا۔ ایف ایس سی میں ایک دفعہ پھر بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کر کے ملک کے مشہور میڈیکل کالج میں وظیفہ حاصل کر کے داخلہ لے لیا اور آخر کار وہ اپنی محنت کے ذریعے ایک کامیاب ڈاکٹر بن گیا۔

علی کو جو جواب ملا تھا، وہ بہت بھرپور اور مکمل تھا۔ اب علی سوچ رہا تھا کہ اس میں کس چیز کی کمی تھی۔ امی جان نے کبھی اس پر ہاتھ تک نہیں اٹھایا۔ ابو جان نے اسے کبھی ڈانٹا تک نہیں۔ اس کی ہر خواہش فوراً پوری کر دی جاتی۔ روپے پیسے کی اسے کبھی کوئی کمی نہیں ہوئی تو پھر اس نے اپنا وقت کیوں برباد کیا۔ اس کی یہ حالت کیوں بنی۔

اب وہ اپنے کیے پر پچھتا رہا تھا۔ اپنے قیمتی وقت کو اپنے ہی ہاتھوں برباد کر کے آنسو بہا رہا تھا۔

اچانک اس کے دل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ”میں سارے پچھتاؤں کا ازالہ کر دوں گا۔ اپنے والدین کو دیے ہوئے دکھوں کو بھی خوشی میں بدل دوں گا۔ میں اب ایک ایک لمحے کی قدر کروں گا اور اپنے آپ کو ضائع ہونے سے بچاؤں گا۔“

آج علی کے امی جان اور ابو جان دونوں اس سے ملنے آئے ہوئے تھے۔ امی جان اس کے پاس بیٹھی ہوئی بار بار اس کی پیشانی چوم رہی تھیں اور پھر علی نے دوسرے کمرے میں ڈاکٹر کو ابو جان سے کہتے سنا۔ ”نشے نے آپ کے بیٹے کے جسم کا اندرونی حصہ دیمک کی طرح چاٹ لیا ہے۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ آپ کا بیٹا زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ جیے گا۔“

یہ ڈاکٹر کی آواز نہیں تھی ایک زوردار کڑک تھی جس نے علی کے دل و دماغ پر گر کر اسے مفلوج بنا دیا تھا۔

یہ کیسی سزا تھی؟ علی اب زندہ رہنا چاہتا تھا۔ اپنی ذات سے متعلقہ لوگوں کو خوش رکھنا چاہتا تھا لیکن وہ بالکل موت کے منہ میں تھا اور اسے اس سے کوئی بھی نہیں بچا سکتا تھا۔ کاش اسے مزید وقت مل جائے۔ اس نے حسرت سے سوچا، لیکن قدرت نے اس کے لیے انوکھی سزا مقرر کر دی تھی۔

☆☆☆

اردو میری زبان

فَنک: عربی زبان میں لومڑی کو کہتے ہیں جو شمالی افریقہ میں پائی جاتی ہے۔ اس کے لمبے نوک دار کان ہوتے ہیں۔ یہی لفظ انگریزی میں تلفظ کی ذرا سی تبدیلی کے ساتھ جاپنچا۔ انگریزی میں مذکورہ لومڑی کو فینک (Fennec) کہتے ہیں۔

خُف: عربی زبان میں بکری اور اونٹ کے کھر کو خُف کہتے ہیں۔ یہ لفظ جب انگریزی میں پہنچا تو وہاں اس کا تلفظ ”ہوف“ کیا جانے لگا۔ Hoof کے معنی ہیں جانوروں کا نوک دار سُم۔ انگریزی میں اس سے فعل ”ہوف“ بن گیا، یعنی کھر سے کسی کو ٹھوکر مارنا۔

چھینٹ: اس مشہور رنگ دار کپڑے کو انگریزی میں چنٹس (Chintz) بولا اور لکھا جاتا ہے جس کے معنی ہیں سفید یا کسی ہلکے رنگ کا کپڑا، جس پر رنگ چھپائی ہو۔ اسی سے لفظ چنٹس (Chintzy) بن گیا یعنی چھینٹ کی طرح کا۔

سلسلہ وار ناول دولت پور میں

تیسری قسط

عزیز اثری



ماں کے آنسو

طارق اس آدمی کو دیکھتے ہی ڈر گیا۔ اس نے سوچا ضرور جعفر کے والد نے اس شخص کو بھیجا ہے۔ یہ پھر مجھے اٹھا کر لے جائے گا۔ طارق کو اپنی ماں کی بات یاد تھی۔ ماں نے کہا تھا اب کسی شخص کے ساتھ نہ جانا۔

طارق نے جلدی سے پھانک کو کھول لیا اور اندر داخل ہونے لگا۔ وہ آدمی جلدی سے آگے بڑھا اور طارق کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”چھوڑو مجھے۔“ طارق نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔

”ڈرو نہیں، یہ تو میں ہوں امام دین۔“ یہ کہتے ہوئے اس آدمی نے پہلے اپنی سیاہ عینک اتاری اور پھر منہ سے چادر ہٹا دی۔ طارق اسے گھورتا رہا، پھر اس آدمی کو پہچان لیا۔

”ارے یہ تو وہی موٹا آدمی ہے، جس نے میری جان بچائی تھی۔“ ”مجھے نہیں پہچانتے؟“ موٹے نے پوچھا۔

”پہچانتا ہوں۔“ طارق نے جواب دیا۔ طارق رک گیا پھر بولا۔

”اب کس لیے آئے ہو؟“ موٹا ہنسنے لگا۔ پھر اس نے جلدی سے دوبارہ کالی عینک اپنی آنکھوں پر چڑھا لی اور چادر لپیٹ کر اپنا منہ چھپا لیا۔ پھر جلدی سے کہنے لگا۔

”آؤ! ادھر آ جاؤ۔ یہاں کوئی دیکھ لے گا۔“

”میں وہاں نہیں جاؤں گا۔“ طارق نے جواب دیا۔

”مجھ سے ڈرتے ہو۔ ابادشاہ لوکا! ڈرنے کی کیا بات ہے؟“

”میں ڈرتا نہیں۔“ طارق نے کہا۔

”تم ڈرتے ہو۔ تمہاری آنکھیں بتا رہی ہیں۔ میں جب اپنے

بیٹے کو گالیاں دیتا تھا تو اس کی آنکھیں بھی ایسی ہو جاتی تھیں۔“ یہ کہہ

کر موٹے نے اپنے چاروں طرف دیکھا پھر بولا۔

”ادھر چلو۔ یہاں کوئی دیکھ لے گا۔“

”میں نہیں جاؤں گا۔“ طارق نے پھر کہا۔

”بیٹے! میں نے تو تمہارے لیے اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالا

ہے۔ چھپ کر تمہارے پاس آیا ہوں، تمہاری مدد کرنے کے لیے اور تم

مجھ سے ڈرتے ہو۔“

طارق کچھ کہنے لگا تھا پھر رک گیا۔ موٹے نے کہا۔

”اگر مجھے کسی نے یہاں دیکھ لیا تو میں مارا جاؤں گا۔“

طارق نے کہا۔ ”ادھر چلیں، سامنے درخت کے پاس کھڑے

رہیں۔ میں گھر جاتا ہوں اور اپنی امی سے پوچھتا ہوں۔ اگر انہوں

نے اجازت دے دی تو میں آپ کے پاس آ جاؤں گا۔ اگر میں نہ آیا

تو پھر آپ واپس چلے جائیں۔“ یہ کہہ کر طارق نے پھانک کھولا اور

جلدی سے اندر آ گیا۔

طارق نے مڑ کر دیکھا۔ موٹا آدمی اسی درخت کی طرف جا رہا تھا۔ طارق کی ماں پھانک کی طرف آرہی تھیں۔ انھوں نے طارق کو سڑک پر آتے دیکھ لیا تھا۔ پھر دیکھا تھا کہ طارق پھانک کی طرف آیا ہے لیکن اس کے بعد انہیں دکھائی نہیں دیا کیوں کہ راستے میں ایک آم کا درخت پڑتا تھا۔ جب طارق کچھ دیر تک کوارٹر میں نہ آیا تو اس کی ماں کو حیرانی ہوئی کہ طارق باہر کھڑا کیا کر رہا ہے۔ وہ یہ دیکھنے کے لیے کہ طارق رک کیوں گیا ہے، خود پھانک کی طرف آرہی تھیں۔ ماں کی نظر چادر والے آدمی پر پڑی تو ان کا دل ڈر سے دھڑکنے لگا۔ ماں بے تاب ہو کر بیٹے کی طرف دوڑیں۔ اسی وقت طارق پھانک میں داخل ہو کر کوارٹر کی طرف آ رہا تھا۔ اس نے سامنے سے اپنی ماں کو دوڑتے اور آوازیں دیتے سنا تو بھاگ کر گیا اور ماں نے اسے سینے سے لگا لیا۔

”میرے بیٹے، میرے لال!“ ماں کا دل بڑی طرح دھڑک رہا تھا۔
”کیا بات ہے ماں!“ طارق نے اپنا سانس ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔
”وہ آدمی کون تھا بیٹا؟“

”وہ تو موٹا تھا ماں!“ طارق نے ماں سے الگ ہوتے ہوئے کہا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔
”کون موٹا؟“ ماں نے پوچھا۔

”وہی..... جس نے رات کو میری جان بچائی تھی۔“
”اللہ اس کا بھلا کرے لیکن بیٹا اب وہ کس لیے آیا ہے؟“ ماں نے پوچھا۔

”وہ کہتا تھا میں کچھ بتانے آیا ہوں۔ میرے ساتھ ادھر چلو۔“
”کہیں مت جانا بیٹا!“
”کوئی ڈر کی بات نہیں ماں! وہ میرا دشمن نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے اس کا بیٹا بھی میری طرح تھا۔“

”نیک آدمی ہر بچے کو اپنا ہی بچہ سمجھتے ہیں۔“
”تو اس کے ساتھ چلا جاؤں؟“ طارق نے پوچھا۔
”اس نے جو کچھ بتانا ہے یہاں کیوں نہیں بتا دیتا؟“ ماں نے کہا۔
”بات یہ ہے ماں! کہ وہ خود چھپ کر آیا ہے۔ وہ کہتا ہے کسی نے اسے پہچان لیا تو اس کی جان خطرے میں پڑ جائے گی۔“
”تو پھر اسے یہیں بلا لاؤ۔ اس سے کہنا کہ یہاں کوئی نہیں۔ ہمارے کوارٹر میں بھی کوئی نہیں۔ وہاں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔“ یہ سن کر طارق خوش ہوا۔ ماں نے طارق کے کندھے سے بستہ اتار لیا

اور بستہ لے کر کوارٹر کی طرف جانے لگی۔

طارق پھانک کھول کر باہر نکلا اور بھاگ کر موٹے کے پاس آ گیا۔ موٹے نے کہا۔

”تم آگے آگے چلو، میں پیچھے آتا ہوں۔“ طارق آگے چلنے لگا اور موٹا اس کے پیچھے۔

ابھی وہ کوارٹر سے کچھ فاصلے پر ہی تھے کہ فریدہ کی آواز آئی۔ فریدہ کافی دیر سے کوٹھی کے برآمدے میں کھڑی طارق کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے بھی طارق کو پھانک کی طرف دیکھ لیا تھا۔ اس نے چادر والے آدمی کو طارق سے باتیں کرتے، طارق کی ماں کے پاس آتے اور اسے دوبارہ چادر والے آدمی کے پاس جاتے دیکھ لیا تھا۔ فریدہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ چادر والا موٹا آدمی کون ہے۔ اس نے آج تک طارق اور اس کی ماں کے پاس کسی آدمی کو نہیں دیکھا تھا۔

طارق نے فریدہ کی آواز سنی تو وہ رک کر کھڑا ہو گیا۔ موٹا آدمی بھی رک گیا اور گھبرا کر بولا۔

”یہ لڑکی شاید ادھر آرہی ہے۔ میرے متعلق اسے نہ بتانا اور کسی کو بھی نہ بتانا۔ اپنی ماں سے کہہ دینا کہ کسی کو نہ بتائے۔ نہیں تو میں مارا جاؤں گا۔“

فریدہ کی دوسری آواز آئی۔ ”طارق.....“

موٹا اور بھی گھبرا گیا وہ جلدی سے بولا۔

”وہ ادھر ہی آرہی ہے..... میری بات یاد رکھنا میں پھر آؤں گا۔“
یہ کہہ کر موٹا آدمی واپس پھانک کی طرف مڑا اور تیز تیز دوڑنے لگا۔
موٹا آدمی کوٹھی کے بڑے پھانک کے قریب پہنچ چکا تھا۔ فریدہ طارق کے پاس کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ طارق نے مڑ کر بڑے پھانک کی طرف نظر دوڑائی۔ جب دیکھا کہ موٹا آدمی پھانک سے نکل کر بڑی سڑک پر پہنچ گیا ہے تو طارق کی تسلی ہو گئی۔ اس نے ایک لمبا سانس لیا۔ فریدہ بولی۔

”وہ آدمی کون تھا؟“

”کون آدمی؟“ طارق گھبرا کر بولا۔

”وہی جو ابھی تمہارے پاس آیا تھا۔“ فریدہ کہنے لگی۔ ”بھئی وہ موٹا سا چادر والا آدمی۔“

”وہ..... میں..... وہ..... میں.....“ طارق پریشان ہو گیا۔ فریدہ ہنسنے لگی۔ طارق اپنے کوارٹر کی طرف جانے لگا۔

”کہاں جا رہے ہو؟“ فریدہ نے کہا۔

”گھر جا رہا ہوں۔ تم اپنی کوٹھی میں جاؤ۔“ طارق نے کہا اور



جلدی سے چلنے لگا۔
”میں تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گی۔“ فریدہ بولی۔

”مجھے..... فریدہ مجھے.....“
”کیا مجھے کہہ رہے ہو؟“ فریدہ نے کہا اور طارق کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔
”چلو وہاں لان میں بیٹھ کر چائے پیئیں گے۔ پھر کیرم کھیلیں گے۔“
”مجھے کام ہے..... مجھے جانے دو فریدہ۔“ طارق نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور پھر چلنے لگا۔

”اچھا تو پھر جاؤ..... میں بھی کبھی تمہارے ساتھ نہیں بولوں گی۔“ فریدہ نے غصے سے کہا۔ یہ سن کر طارق کے قدم رک گئے۔ اس نے پہلے فریدہ کی طرف دیکھا پھر اپنے کوارٹر کی طرف۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ ایک طرف فریدہ تھی اور دوسری طرف ماں کا حکم۔

فریدہ اپنی کوٹھی کی طرف جانے لگی۔ طارق کا دل کاپنے لگا۔ کیا فریدہ مجھ سے روٹھ گئی ہے۔ طارق نے سوچا۔ اب فریدہ مجھ سے کبھی بات نہیں کرے گی، میں کیا کروں؟ کیا کروں؟
”فریدہ!“ طارق نے آواز دی۔ اتنے میں طارق کی ماں وہاں آ گئیں۔ طارق ماں کو دیکھتے ہی چلا لیا۔
”ماں! وہ مجھ سے روٹھ گئی ہے۔“

”بیٹے.....“
”کہتی ہے، تم سے کبھی نہیں بولوں گی۔“

طارق کی ماں نے فریدہ کو آواز دی۔ فریدہ رک گئی۔ مڑ کر طارق کی ماں کو دیکھا اور بھاگ کر ان سے لپٹ گئی۔ فریدہ روتے ہوئے بولی۔
”آپ تو کہتی تھیں طارق میرے ساتھ کھیلے گا۔“

”کھیلے گا بیٹی۔“ طارق کی ماں نے کہا اور پیار سے فریدہ کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔

”وہ تو مجھ سے بات ہی نہیں کرتا۔“

”کیوں نہیں کرتا۔“ طارق کی ماں بولیں۔ پھر ماں نے طارق سے کہا۔

”تم فریدہ بیٹی کے ساتھ کھیلا کرو۔ پہلے کی طرح اس کے ساتھ رہا کرو۔“

”ماں!“ طارق حیران ہو کر کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ ماں جلدی سے بولی۔

”ہاں بیٹے..... پچھلی باتیں بھول جاؤ۔“ یہ کہہ کر ماں طارق کا ہاتھ پکڑ کر اسے آگے لائیں اور فریدہ سے کہنے لگیں۔

”جاؤ بیٹی، تم دونوں بیٹھ کر کھیلو۔“ اور پھر طارق سے کہا۔
”میں تمہارا کھانا وہیں لے آتی ہوں۔“

طارق فریدہ کے ساتھ لان کی طرف جانے لگا۔ اس نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا۔ اس کی ماں وہیں کھڑی تھی اور اپنے میلے دوپٹے میں اپنے آنسو چھپا رہی تھی۔

اگلے دن اتوار تھا اور اسکول سے چھٹی۔ صبح کو جب طارق اٹھا تو اس کی ماں کوٹھی میں کام کرنے کے لیے جا چکی تھیں۔ طارق آج دیر سے اٹھا تھا۔ بات یہ تھی کہ رات پھر اس کے سر میں درد ہوتا رہا۔ دایاں بازو بھی دکھتا تھا۔ پہاڑی پر سے گرنے کی وجہ سے وہ زخمی جو ہو گیا تھا۔ رات کو طارق کی ماں بہت دیر تک اپنے بیٹے کے بازو اور سر پر سینک کرتی رہیں۔

طارق سو کر اٹھا تو ابھی تک اسے درد ہو رہا تھا۔ اس نے سر پر

بہت تھکی ہوئی تھی اور میرے سر میں بھی درد ہو رہا تھا، اس لیے مجھے یہ بات یاد نہ رہی۔

طارق نے سوچا اب میں ماں سے ضرور پوچھوں گا۔ ماں تھوڑی دیر کے لیے یہاں آئے گی۔ ابھی آتی ہوگی۔ طارق نے دیکھی مانجھ دھو کر برتنوں میں رکھ دی۔ دیسی صابن سے اپنے ہاتھ صاف کیے اور پھر جلدی سے باہر نکل کر اپنی ماں کا انتظار کرنے لگا۔

ابھی وہ دروازے ہی میں تھا کہ ایک موٹر کوٹھی کے دروازے پر آ کر رکی۔ موٹر کا ہارن بجا۔ مالی نے دوڑ کر پھانک کھولا۔ موٹر اندر داخل ہوئی۔ باغیچے کے پاس آ کر رک گئی۔ طارق نے اپنے آپ سے کہا۔ یہ موٹر میں نے پہلے بھی دیکھی ہے۔ کہاں دیکھی ہے؟ اور اسے فوراً یاد آ گیا یہ تو وہی گاڑی ہے جس میں موٹا اور لمبا آدمی مجھے ڈال کر پہاڑی پر لے گئے تھے۔ طارق کا دل کانپنے لگا۔

طارق اپنے چھوٹے سے گھر کے دروازے پر کھڑا تھا۔ اس نے دیکھا کہ موٹر کا ڈرائیور باہر نکلا ہے۔ ڈرائیور نے باہر آ کر موٹر کا دروازہ کھولا اور اندر سے ایک بھاری بھر کم آدمی نکلا ہے۔ اس آدمی نے سفید شلوار اور بوسکی کی قمیص پہن رکھی تھی۔ قمیص میں سونے کے بٹن لگے تھے اور اس کے سر پر جناح کیپ تھی۔

اس آدمی کے پیچھے موٹر سے جعفر اتر ا۔ طارق نے جعفر کو دیکھا پھر بھاری بھر کم آدمی کو۔ اس آدمی کی شکل جعفر سے ملتی تھی۔ طارق سمجھ گیا کہ یہ جعفر کے ابا جان ہیں۔ اب طارق نے دیکھا کہ کوٹھی کے برآمدے سے فریدہ کے ابا نکلے ہیں۔ انہوں نے زور سے ”السلام علیکم“ کہا اور پھر جعفر کے ابا سے لپٹ گئے ہیں۔ اس کے بعد فریدہ کے ابا نے بڑے پیار سے جعفر کے سر پر ہاتھ پھیرا اور وہ تینوں برآمدے کی طرف چلے گئے۔

طارق کو یہاں سے کوٹھی کا برآمدہ نظر نہیں آتا تھا، اس لیے وہ واپس اندر آ گیا اور برتنوں کو دیکھنے لگا۔ اس نے سوچا اگر کوئی اور برتن بھی دھونے کے قابل ہے تو اسے دھو کر رکھ دوں گا۔ ماں کوٹھی سے آئے گی تو سارے برتن صاف دیکھ کر خوش ہوگی۔ طارق نے دیکھا کہ کوئی برتن بھی تو ایسا نہیں جسے دھویا جاسکے۔

طارق نے سوچا ماں نے صبح منہ اندھیرے اٹھ کر یہاں جھاڑو دی ہے۔ یہ جگہ بالکل صاف ہے۔ اس نے سوچا چلو میں آج فرش کو پانی سے دھو دیتا ہوں۔ اس نے بالٹی کی طرف دیکھا۔ بالٹی پانی سے بھری ہوئی تھی۔ اس نے کونے میں پڑی ہوئی جھاڑو اٹھائی اور فرش دھونے کے لیے جھکا ہی تھا کہ اس کی ماں آ گئی۔

بندھی ہوئی پٹی کو ہاتھ سے ٹٹولا۔ تھوڑی دیر تک دونوں ہاتھوں سے اپنا سر دباتا رہا۔ پھر اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا۔ اسے معلوم تھا کہ ماں کام پر چلی گئی ہے۔ اس نے سوچا۔ ماں ہمیشہ وقت پر کوٹھی میں جاتی ہے۔ سارا دن کام کرتی ہے۔ اس نے سوچا کہ فریدہ کے ابا اور امی اتنے اچھے ہیں، پھر وہ میری ماں سے سب کام کیوں کراتے ہیں۔ طارق کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی۔

ٹھنڈے پانی سے منہ ہاتھ دھونے سے طارق کو سردی لگی۔ وہ فوراً چولہے کی طرف آیا۔ چولہے میں کچھ آگ باقی تھی۔ چولہے پر چھوٹی دیکھی رکھی تھی۔ طارق سمجھ گیا کہ ماں میرے لیے دیکھی میں چائے ڈال کر چولہے پر رکھ گئی ہے، اس خیال سے کہ میرا بیٹا اٹھے گا تو گرم چائے پیے گا۔ ماں میرا کتنا خیال رکھتی ہے۔ مجھے کسی بات کی تکلیف نہیں ہونے دیتی۔

چولہے کے پاس ہی چنگیر پڑی تھی۔ ایک رومال میں روٹی لپیٹی ہوئی تھی۔ طارق چائے کے ساتھ روٹی کھانے لگا۔ روٹی کھاتے کھاتے سوچنے لگا۔ فریدہ کے ماں باپ اتنے اچھے ہیں۔ فریدہ مجھ سے اتنا پیار کرتی ہے۔ پھر میری ماں ان کے گھر میں نوکرانی کیوں ہے؟ میری ماں ان کے گھر کام کرتے کرتے بوڑھی ہو چلی ہے۔ ماں صبح منہ اندھیرے اتنی سخت سردی میں اٹھتی ہے اور رات کو آٹھ نو بجے واپس آتی ہے۔

ماں نے بتایا تھا کہ یہ چھوٹا سا مکان بھی فریدہ کے ابا نے ہمیں رہنے کے لیے دیا ہے۔ فریدہ کی تو اتنی بڑی کوٹھی ہے۔ ہماری کوٹھی کیوں نہیں؟ ان کے اتنے بڑے کمرے ہیں۔ بجلی لگی ہوئی ہے۔ ہمارا ایک کمرہ ہے اور اس میں بجلی بھی نہیں۔

طارق نے روٹی کھالی۔ گرم چائے کے آخری گھونٹ پیے اور پیالہ دھو کر رکھ دیا۔ پھر خالی دیکھی لے کر اسے مانجھنے لگا۔ اس نے سوچا۔ فریدہ نے تو کبھی پیالہ نہیں دھویا نہ کبھی برتن ہی مانجھتی ہے۔ ہاں ٹھیک ہے۔ یہ سب اس لیے ہے کہ فریدہ کے ماں باپ امیر ہیں اور ہم لوگ غریب ہیں۔ میری ماں نے یہی تو بتایا تھا لیکن لوگ امیر کیسے ہو جاتے ہیں؟ طارق نے سوچا اور پھر اسے اپنی ماں کی باتیں یاد آنے لگیں۔ اس نے سوچا میری ماں بھی عجیب ہے۔ پہلے تو خود ہی کہا تھا، فریدہ سے نہ ملا کرو۔ اس کے ساتھ کھیلا بھی نہ کرو اور کل خود ہی مجھے فریدہ کے ساتھ کھیلنے کے لیے بھیج دیا۔ طارق نے اپنے آپ سے کہا۔ مجھے رات ہی ماں سے پوچھنا چاہیے تھا کہ اس نے پہلے مجھے روکا تھا اور پھر خود ہی فریدہ کے ساتھ کیوں بھیج دیا لیکن رات کو ماں

”یہ کیا کرنے لگے ہو؟“ ماں نے آتے ہی پوچھا۔

”فرش دھونے لگا ہوں۔“ طارق نے جواب دیا۔

”میں دھو دوں گی۔“ ماں نے مسکرا کر کہا۔

”ہر کام آپ خود ہی کرتی ہیں ماں!“ طارق نے روٹھتے ہوئے

کہا۔ ”مجھے کوئی کام نہیں کرنے دیتیں۔“

”یہ کام تمہارے کرنے کے نہیں ہیں۔“ ماں نے جواب دیا اور

قریب آ کر طارق کو پیار کرتے ہوئے بولیں۔

”میرا بیٹا کتنا اچھا ہے۔ ہر وقت میرا خیال رکھتا ہے۔“

”آپ مجھے گھر کا کام کیوں نہیں کرنے دیتیں۔“ طارق نے

کہا۔ ”یہ میرا گھر بھی تو ہے۔“

”تیرا ہی تو گھر ہے بیٹا۔“ ماں نے کہا۔

طارق کو کچھ خیال آیا۔ وہ ماں سے الگ ہو کر بولا۔

”ماں! آپ فریدہ کے گھر میں کیوں کام کرتی ہیں؟“

ماں طارق کی بات سن کر حیران رہ گئیں۔ وہ کچھ سوچنے لگیں۔

”بتائیں نا ماں! فریدہ اتنی بڑی کوٹھی میں رہتی ہے اور ہم اتنے

ذرا سے گھر میں۔ یہاں تو بجلی بھی نہیں اور فریدہ کی کوٹھی میں.....“

طارق نے اتنا ہی کہا تھا کہ ماں بولی۔

”بیٹا! اللہ نے سب کو ایک جیسا نہیں بنایا۔ کسی کو زیادہ دیا ہے،

کسی کو کم۔“

طارق نے کہا۔

”لیکن ہماری استانی جی نے تو بتایا تھا کہ سب انسان برابر ہیں۔“

ماں نے جواب دیا۔

”ہر انسان کو محنت کرنی چاہیے۔ محنت کرنا بڑی بات نہیں۔“

”لیکن دوسروں کے گھر سے کھانا لینا، ان سے پیسے لینا بھی

اچھی بات ہے؟“

ماں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بولی۔

”اچھا ان باتوں کو چھوڑو۔ جاؤ باہر جا کر کھیلو۔ فریدہ تمہیں بلا

رہی ہے۔“

طارق تو اسی بات کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ بولا۔

”آپ نے تو فریدہ کے ساتھ کھیلنے سے منع کر دیا تھا۔“

”ہاں بیٹا! اور طارق نے کہا۔

”آپ نے تو کہا تھا کہ اس کے ساتھ آنے جانے اور کھیلنے سے

میری جان کو خطرہ.....“ ماں نے بیٹے کی پوری بات سننے سے پہلے

اسے سینے سے لگا لیا۔

”میرے لال! اللہ تیری حفاظت کرے گا۔ فریدہ تمہارے بغیر

بہت روتی ہے۔ کھاتی پیتی بھی نہیں۔ وہ بھی تو میری بیٹی ہے۔“

”بیٹی ہے تو پھر ہمارے ساتھ کیوں نہیں رہتی؟“ طارق نے کہا

اور ماں بولی۔

”ایک ہی بات ہے۔ تم جو دن بھر اس کے ساتھ رہتے ہو۔ پھر

اس کے ابا اور امی اتنے اچھے ہیں، انہوں نے ہم پر بہت احسان کیا

ہے۔ بیٹا! فریدہ بھی اتنی اچھی ہے۔ ہے نا اچھی؟“

”ہاں بہت اچھی ہے۔ فریدہ بہت اچھی ہے ماں!“ طارق نے کہا۔

”تو جاؤ اس کے ساتھ جا کر کھیلو۔“

”بہت اچھا.....“ طارق نے کہا۔ ”لیکن پہلے میں فرش تو دھو لوں۔“

”نہیں بیٹے، تم جا کر کھیلو۔ پھر تم دونوں باغ میں بیٹھ کر پڑھنا۔

جاؤ میرے لال!“ طارق اٹھنے ہی لگا تھا کہ باہر سے فریدہ کی آواز آئی۔

”لو وہ آگئی ہے۔“ ماں نے کہا۔

فریدہ دروازے پر کھڑی مسکرا رہی تھی۔ وہ اندر آگئی۔ فریدہ کے

ساتھ جعفر بھی تھا۔

”جعفر!“ طارق کے منہ سے نکلا۔

جعفر آگے بڑھا اور آتے ہی طارق کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے

لیا۔ وہ بولا۔

”طارق یار! کیا حال چال ہے؟“

طارق حیران کھڑا تھا۔ وہ اس بات پر حیران تھا کہ ایک تو جعفر

اس کے گھر آیا ہے اور دوسرے اتنے پیار سے حال چال پوچھا ہے۔

آؤ باغ میں چل کر کھیلنے ہیں۔ جعفر نے طارق کا بازو پکڑ لیا اور

اسے باہر لے جاتے ہوئے بولا۔

”آج سے تم میرے دوست ہو۔“ طارق اور بھی حیران ہوا اور

فریدہ بہت خوش تھی۔ وہ تینوں باغ کی طرف جانے لگے۔

جعفر باغ کی طرف جاتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ میرے ابا جان

نے مجھے جو کچھ کہا ہے، میں اس پر عمل کروں گا۔ انہوں نے بتایا ہے

کہ طارق سے دشمنی ظاہر کر کے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ اب تم اس کے

ساتھ دوستی پیدا کرو۔ طارق کو اتنا دوست بناؤ کہ وہ تمہاری ہر بات

ماننے لگے۔

جعفر طارق کا بازو پکڑ کر جا رہا تھا اور اس سے ہنس ہنس کر باتیں

کر رہا تھا۔ دل میں کہہ رہا تھا۔ ”طارق بیٹے! میں تمہیں دوست بنا رہا

ہوں اور دوست بنا کر ایسا مزہ چکھاؤں گا کہ تم عمر بھر یاد رکھو گے۔“

(باقی آئندہ)

نقل کرتا۔ وہ اور بھی کئی بُری عادتیں عامر سے سیکھ چکا تھا۔ چوری کرنا، جھوٹ بولنا، ماں باپ کی بات نہ ماننا، نماز نہ پڑھنا اور قرآن مجید نہ پڑھنا۔ سب بہت پریشان تھے کہ اسے اچانک کیا ہو گیا ہے۔ اللہ بہت مہربان ہے، آخر اللہ نے احمد کو سیدھے راستے پر لانے کے لیے ایک نیک صفت لڑکا عثمان بھیجا۔ عثمان بہت اچھا بچہ تھا۔ جب سے وہ کلاس میں آیا اس نے ہمیشہ اوّل پوزیشن حاصل کی۔ اسے احمد کو دیکھ کر بہت دکھ ہوا۔ اس نے سوچا کہ احمد ایک اچھا بچہ تھا جسے عامر نے برباد کر دیا۔ اس نے احمد کو سیدھے راستے پر لانے کا ارادہ کر لیا۔

☆.....

ایک دن اس نے بریک ٹائم میں احمد کو کہا کہ تم نقل کیوں کرتے ہو؟ چوری کیوں کرتے ہو؟ ماں باپ کی بات کیوں نہیں مانتے ہو؟ نماز کیوں نہیں پڑھتے ہو؟ ”کیوں؟ کیوں؟“ پہلے تو احمد نے اس کے ساتھ بدتمیزی کی مگر اس کے اچھے رویے سے متاثر ہو کر بولا: ”یہ سب مجھے عامر نے کہا تھا۔“ عثمان بولا: ”تم ایک اچھے لڑکے تھے۔ تم اپنے استاد کا، ماں باپ کا، اسکول کا، ملک کا نام روشن کر سکتے ہو۔ تم سیدھے راستے پر واپس آ جاؤ۔ پلیز، پلیز احمد اپنے آپ کو برباد مت کرو۔ ابھی تمہارے پاس سنبھلنے کا وقت باقی ہے۔ تم نماز اور قرآن پڑھتے تھے، جھوٹ سے پاک تھے۔ نقل یا چوری کبھی نہیں کی تھی۔ میرے بھائی تم پہلے والے راستے پر دوبارہ آ سکتے ہو، اگر آنا چاہو۔ عامر کے لیے بربادی ہی بربادی ہے، اس کو چھوڑ دو۔ قرآن مجید میں سورۃ انعام میں ہے۔ ترجمہ: ”(اور دیکھو!) یہ (دین اسلام ہے) میرا سیدھا راستہ، لہذا تم اسی پر چلو۔“ یقینی طور پر کام یابی سے ہم کنار ہو جاؤ گے اور اگر تم سیدھے راستے پر نہیں آؤ گے تو اس کی سزا تمہیں دنیا اور آخرت دونوں میں ملے گی۔“ عثمان نے ایک نظر احمد کو دیکھا، اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر چکی تھیں۔ وہ پھر بولا۔ ترجمہ: ”اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ اس کے راستے سے ہٹا کر تمہیں پراگندہ کر دیں گے۔“ اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ بولتا احمد پُر عزم لہجے میں بولا۔ ”میں ان شاء اللہ ضرور ہدایت کی طرف آؤں گا۔ میں آئندہ کبھی غلط کام نہیں کروں گا۔ تم نے میری آنکھیں کھول دیں۔ تم مجھے اندھیرے سے روشنی کی طرف لے کر آئے۔ تم



سیدھا راستہ

(حافظہ آسیہ تجمل خاور، لاہور)

احمد ایک اچھا بچہ تھا۔ ہر کوئی اس سے خوش تھا۔ ماں باپ اور اساتذہ کرام کی آنکھوں کا تارا تھا۔ جماعت میں ہمیشہ اوّل آتا تھا۔ ایک دن عامر جو احمد سے حسد کرتا تھا، اس کے پاس آیا اور اس سے کہا۔ ”یار تم یونہی اتنی محنت کرتے ہو، نقل کر لیا کرو اور گھر میں آرام سے کھیلا کرو۔“ احمد بولا۔ ”بھئی یہ وقت دوبارہ نہیں آئے گا، یہ سب کام تو ہوتے رہتے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا اور عامر بھی اپنی جگہ پر چلا گیا۔ اب تو عامر کا معمول بن گیا۔ وہ روزانہ آ کر احمد سے کہتا، اتنی محنت کیوں کرتے ہو، مزے کیا کرو۔ آخر ایک دن احمد نے سوچا کہ عامر اتنا کہتا ہے، ایک مرتبہ نقل کر کے دیکھ لیتے ہیں۔ اس دن چھٹی کے بعد احمد گھر گیا اور خوب کھیلا۔ سائیکل چلائی اور نماز بھی نہ پڑھی، نہ ٹیسٹ کی تیاری کی۔ البتہ اتنا ضرور کیا کہ ایک صفحہ پر ٹیسٹ لکھ کر رکھ لیا۔ احمد نے سوچا کہ آج تو خوب مزہ آیا، اگر روزانہ ایسا ہو تو کتنا مزہ آئے گا۔ اگلی صبح وہ اٹھا اور نماز پڑھے بغیر ناشتا کر کے اسکول چل دیا۔ اسکول جا کر اس نے عامر کو بتایا کہ آج اس نے ٹیسٹ کی تیاری نہیں کی، آج وہ نقل کرے گا۔ عامر بہت خوش ہوا اور دل میں سوچا کہ یہ تیر تو نشانے پر لگا ہے۔ اس دن احمد نے سارا ٹیسٹ نقل کیا۔

احمد کی عادت پختہ ہو چکی تھی۔ جب بھی کوئی ٹیسٹ ہوتا وہ

نے مجھے سیدھا راستہ دکھایا۔ میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔“ عثمان بولا۔ بھائی احسان نہیں، میرا فرض تھا۔“ پھر دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے ہاتھ پکڑتے ہوئے جماعت میں چلے گئے کیوں کہ بریک بند ہو گئی تھی۔

(پہلا انعام: 120 روپے کی کتب)

یہ کیا ہو گیا!!!!

(آمنہ اکبر گوندل، بھیرہ)

”کب..... کیا وہ واقعی مر گیا؟؟ نہیں! ایسا نہیں ہو سکتا۔“ شاید وہ صرف زخمی ہوا ہو۔“ ”کیا؟ تم نے اس کو قتل کر دیا؟“ ”نہیں! کبھی نہیں۔ یہ کیا ہو گیا؟“ یہ سب آوازیں چھت پر کھڑے بچوں کی تھیں جو غالباً آپس میں کزنز تھے۔ وہ تعداد میں چار تھے اور اس وقت نہایت بوکھلاہٹ کے عالم میں تھے۔ آج شب برأت تھی ہر طرف پٹاخوں کی گونج تھی۔ کہیں انار چھوڑے جا رہے تھے تو کہیں موم بتیوں کے ذریعے گھر روشن ہو رہے تھے۔ آفاق اور اس کے کزنز نے جب پٹاخوں کی آوازیں سنیں تو ان کے اندر بھی جوش پیدا ہوا۔ وہ سب بازار گئے اور پٹاخے لے آئے۔ پھر سب چھت پر گئے تو انہیں ایک نئی شرارت سوچھی۔ انہوں نے پٹاخوں کو آگ لگائی اور ایک ساتھ ہی پانچ چھت سے نیچے پھینک دیے۔ پٹاخے نیچے گر کر ایک بوڑھے شخص کے پاؤں تلے آ کر پھٹ پڑے۔ بوڑھا شخص اتنی زیادہ گونج برداشت نہ کر سکا اور بے دم ہو کر گر پڑا۔ گرنے کی وجہ سے اس کے سر سے خون بہنے لگا۔ ادھر آفاق اور اس کے کزنز نے اپنی غلطی کا اتنا بھیاںک انجام دیکھا تو مارے خوف کے کانپنے لگے۔ اتنے میں کچھ لوگ اس بوڑھے شخص کو اسپتال لے گئے۔ ادھر ان سب کی سانسیں رکی ہوئی تھیں کیوں کہ جو لوگ بوڑھے کو اسپتال لے کر گئے تھے، وہ جانتے تھے کہ پٹاخے کس چھت سے گرے ہیں؟ اگر بوڑھے کو کچھ ہو جاتا تو وہ چاروں جیل کی ہوا کھا رہے ہوتے کیوں کہ پٹاخوں پر پابندی ہونے کے باوجود انہوں نے پٹاخے چھوڑے اور اگر چھوڑے بھی تھے تو کسی کا نقصان کیوں کیا؟ اس بنا پر ان کا جیل جانا یقینی تھا۔ ادھر وہ سب پریشان تھے۔ آخر آفاق نے کہا۔ ”ہمیں امی جان کو اعتماد میں لے

لینا چاہیے، شاید وہ یہ بات سمجھ جائیں کہ ہم سے یہ غلطی انجانے میں سرزد ہوئی ہے۔“ سب جانتے تھے کہ بے خبری میں ان سے یہ غلطی ہوئی ہے لیکن پھر بھی انہوں نے آفاق سے اتفاق کیا اور امی کو سب کچھ بتا دیا۔ امی نے انہیں بہت ڈانٹا۔ پھر کہنے لگیں۔ ”آج کی رات بہت برکتوں اور رحمتوں والی ہے۔ جاؤ اور جا کر اللہ سے اپنے کیے کی معافی مانگو اور اس بوڑھے شخص کی سلامتی کی دعا کرو، ورنہ تم سب اپنے آپ کو کبھی معاف نہ کروا سکو گے۔“ وہ سب اسی وقت جائے نماز بچھا کر بیٹھ گئے اور رو کر اللہ سے التجائیں کرنے لگے۔ اللہ بھی بہت رحیم و کریم ہے، جب اس کے بندے اس سے خلوص دل سے کچھ مانگتے ہیں، وہ دے دیا کرتا ہے۔ سو اللہ نے انہیں بھی معاف کر دیا۔ اتنے میں دروازے پر گھنٹی بجی۔ دروازہ چونکہ بند نہیں تھا۔ اسی لیے آنے والے شخص نے کسی کے پوچھنے کا انتظار نہیں کیا اور تقریباً دوڑتا ہوا اندر آیا۔ وہ شخص آفاق کا پڑوسی تھا۔ اس نے پھولی ہوئی سانس میں بتایا کہ اس بوڑھے کو ہوش آ گیا ہے اور اللہ کے فضل سے اب اس کی حالت خطرے سے باہر ہے۔ آفاق اور اس کے کزنز نے یہ سن کر اللہ کا شکر ادا کیا اور سب نے کبھی پٹاخے نہ چلانے کا عزم کر لیا۔ یہ واقعہ ان سب کی زندگی بدل دینے کو کافی تھا۔ اب ہر شب برأت کو یا کسی ایسے موقع پر جب پٹاخے چھوڑے جاتے تھے ان کو وہ واقعہ یاد آ جاتا اور وہ اس کام سے باز رہتے۔ ہر شب برأت کو اب وہ سب صرف اللہ کی عبادت کرتے ہیں کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ پٹاخے چھوڑنے کے کتنے نقصانات ہیں اور عبادت کرنے کے کتنے فوائد.....!

(دوسرا انعام: 100 روپے کی کتب)

گفتاریت شعاری

(علینہ حسین، لاہور)

آمنہ ایک پیاری اور نیک سیرت لڑکی تھی۔ اس کے والد ایک سرکاری ملازم تھے مگر بہت ایمان دار تھے اس کے والد کا نام عبدالملک تھا اور اس کی والدہ کا نام نایاب بی بی تھا۔ اس کی والدہ ایک نیک خاتون تھیں۔ وہ دن کا زیادہ حصہ عبادت میں گزارتی تھیں اور بس ایک ہی دعا کیا کرتی تھیں کہ ”یا رب میری اولاد کو

نیک سیرت بنا دے۔“ ان کی اس دعا کا نتیجہ بھی ویسا ہی نکلا جیسی ان کی خواہش تھی۔

آمنہ بھی ان کی طرح نیک سیرت بنی۔ آمنہ اپنے والدین پر بوجھ نہیں بننا چاہتی تھی اس لیے اس کو جو ملتا پہن لیتی، جو ملتا کھا لیتی اور جتنے پیسے ملتے اسی پر گزارہ کرتی۔

آمنہ کو روزانہ کے صرف دس روپے ملا کرتے تھے اور وہ ان کو بغیر کچھ کہے لے لیتی تھی۔ جب آمنہ اسکول میں جاتی تو باقی بچے اس کے جیب خرچ پر ہنستے۔ وہ بے چاری خاموش بیٹھی رہتی۔ آج جب آمنہ اسکول گئی تو روز کی طرح اس کی امی نے اسے ٹفن اور دس روپے دیے۔ آج آمنہ بہت اداس تھی۔ اس کی امی نے اداسی کی وجہ پوچھی تو وہ کچھ نہیں بولی۔ آمنہ اس لیے اداس تھی کیوں کہ اب روز بچے اس پر ہنستے تھے، یہاں تک کہ اس کی اپنی سہیلی فوزیہ نے بھی اس سے منہ پھیر لیا تھا۔

آج جب آمنہ اسکول پہنچی تو وہ روز کی طرح اپنا بستہ کھول کر اس میں سے کتاب نکال کر پڑھنے لگی۔ جب بریک ہوئی تو اس نے بیگ سے دس روپے نکالے اور اس میں سے تین روپے خرچ کر لیے۔ اس کی سہیلی فوزیہ نے کہا۔ ”آمنہ تم نے سات روپے کیوں بچائے؟“ آمنہ بولی۔ ”میں نے کتابوں کی دکان پر ایک کتاب دیکھی ہے جس کا نام سیرت رسول ہے۔ میں اس کتاب کو خریدنا چاہتی ہوں اس لیے میں نے کچھ دنوں سے پیسے جمع کرنا شروع کیے ہیں۔“ فوزیہ بولی۔ ”آمنہ تم اپنے امی اور ابو سے بھی تو کہہ سکتی تھی، اتنی مصیبت اٹھانے کی کیا ضرورت ہے۔“

آمنہ بولی۔ ”میں اپنے امی ابو پر بوجھ نہیں بننا چاہتی۔ اس لیے میں نے ان سے نہیں کہا تھا۔“ فوزیہ نے کہا۔ ”آمنہ پاگل اور بے وقوف ہے۔“ اور یہ کہہ کر چلی گئی۔ اب آمنہ کو پیسے جمع کرتے ہوئے کافی دن ہو چکے تھے اور اتنے پیسے جمع ہو گئے جن کی کتاب آسکے۔ آج آمنہ بہت خوش تھی۔ جب شام کو عبدالملک صاحب گھر میں آئے تو آمنہ نے اپنے ابو سے کہا۔ ”بابا جان! میں ایک کتاب خریدنا چاہتی ہوں۔“ عبدالملک صاحب بولے۔

”بیٹی، میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ تمہیں کتاب دلا سکوں۔“ آمنہ بولی۔ ”بابا جان! بس آپ میرے ساتھ چلیں۔“ آمنہ اپنے بابا کا ہاتھ پکڑ کر بک اسٹال کی طرف چل پڑی۔ اس وقت عبدالملک صاحب بہت پریشان تھے کہ آمنہ کو کتاب کیسے دلائیں۔ جب وہ دونوں بک اسٹال پر پہنچے تو آمنہ نے بک اسٹال والے لڑکے سے کہا۔ ”بھائی! وہ کتاب دینا۔“ اس لڑکے نے آمنہ کو کتاب دی تو آمنہ نے اسے سو روپے پکڑائے اور کتاب لے لی۔ اس وقت آمنہ کے ابو بہت حیران ہوئے کہ آمنہ کے پاس پیسے کہاں سے آئے۔ دکان سے باہر نکل کر آمنہ کے ابو نے اس سے پوچھا۔ ”بیٹی! تمہارے پاس یہ پیسے کہاں سے آئے؟“ آمنہ بولی۔ ”ابو میں نے یہ پیسے جمع کیے ہیں۔ جب امی مجھے دس روپے دیتی تھیں تو میں ان میں سے صرف تین روپے خرچ کرتی تھی۔ یہ وہی پیسے تھے۔“ یہ سن کر آمنہ کے ابو کو بہت خوشی ہوئی اور انہوں نے اپنی پیاری بیٹی کو گلے لگایا۔

پیارے بچو! میں چاہتی ہوں کہ آپ بھی آمنہ کی طرح کفایت شعاری کریں تاکہ آپ اپنی ضرورت کی چیز خود خرید سکیں اور آپ کو والدین سے نہ کہنا پڑے۔ (تیسرا انعام: 80 روپے کی کتب)

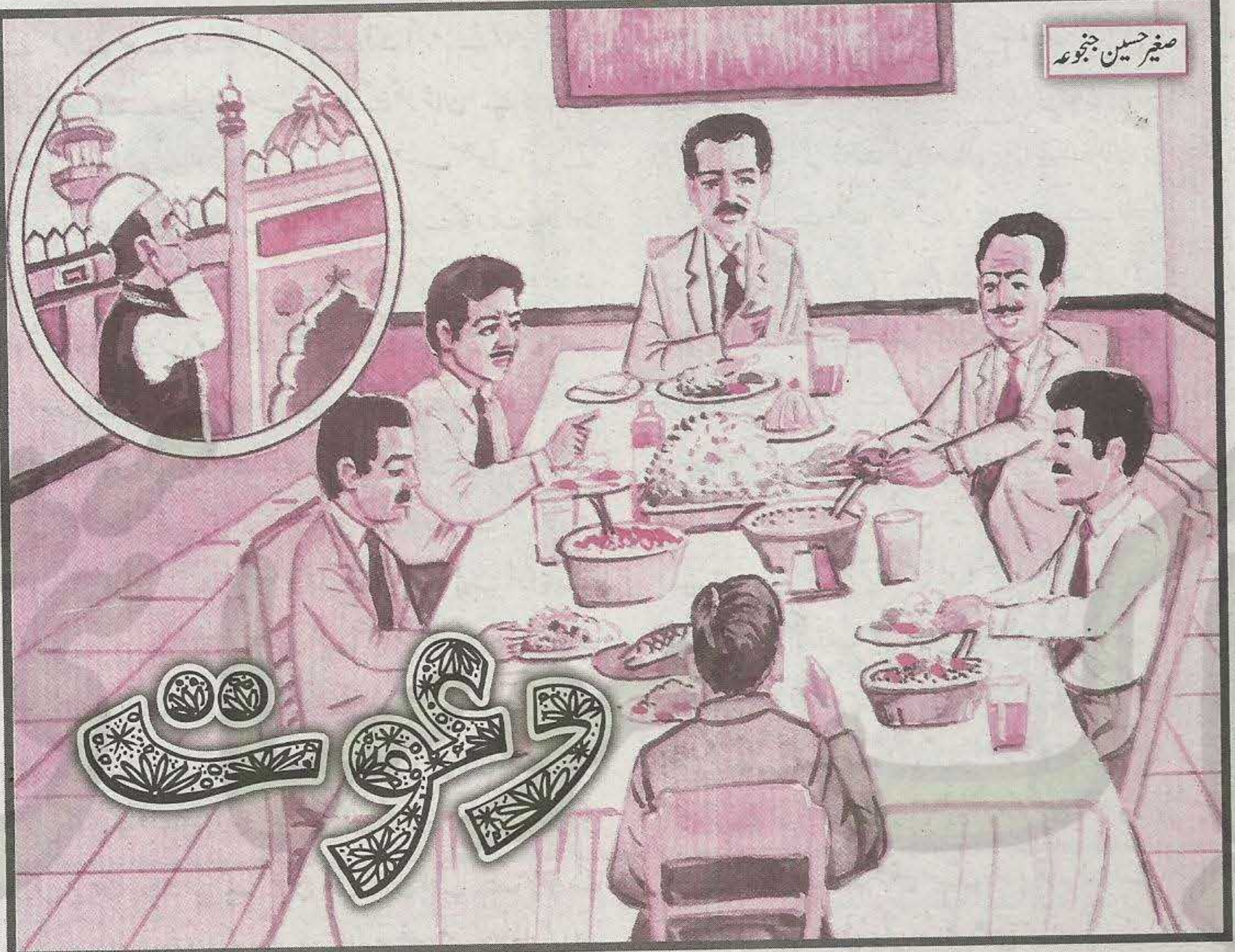
☆☆☆

ضروری بات

بچوں میں کہانی لکھنے کی صلاحیت پیدا کرنے اور اردو کے فروغ کے لیے سلسلہ ”آپ بھی لکھیے“ میں کہانیوں کی تعداد میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔ آپ کی ارسال کردہ کہانی کم از کم 200 الفاظ پر مشتمل ہونی چاہیے۔ علاوہ ازیں انعامات کی مالیت میں بھی اضافہ کیا گیا ہے جس کا اطلاق ماہ جون سے ہوگا۔ انعامات کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

پہلا انعام:	195 روپے کی کتب
دوسرا انعام:	175 روپے کی کتب
تیسرا انعام:	125 روپے کی کتب
چوتھا انعام:	115 روپے کی کتب
پانچواں انعام:	95 روپے کی کتب

صغیر حسین جنجوعہ



چائے کا ٹائم ہوا تو چیرا سی نے گھنٹی بجادی جس پر تمام افسر کینٹین میں چلے گئے۔ انجو! دو چائے اور پکوڑوں کی ایک پلیٹ لے آؤ۔ یہ ارسلان کی آواز تھی جس کے ساتھ اس کا دوست عارف تھا۔ دونوں کی دوستی کافی عرصے سے تھی اور وہ اس دفتر میں کافی عرصے سے ملازمت کر رہے تھے۔ اتنے میں اکرم بھی اندر داخل ہوا تو ارسلان اور عارف نے انہیں بھی کھانے کی دعوت دی مگر اس نے شکریہ کہا اور آگے چلا گیا۔ اکرم اس دفتر میں نیا افسر آیا تھا وہ وہاں سب سے دوستی کر چکا تھا مگر شان سے دوستی نہ کر پایا۔ آج بھی بریک میں اکرم، شان کو کہتا رہا کہ چلو میرے ساتھ آج تمہیں کینٹین سے کچھ اچھا سا کھانا کھلاؤں مگر شان نے مصروف ہونے کا بہانہ بنایا اور ہر بار وہ یہی بہانہ بناتا تھا۔ اکرم نے کینٹین سے چائے منگوائی اور پینے بیٹھ گیا۔ اتنے میں شان بھی کینٹین میں داخل ہوا تو حسب معمول ارسلان اور عارف نے اسے اپنے ساتھ کھانے میں شریک ہونے کو کہا۔ شان نے ایک پکوڑا اٹھایا اور آگے بڑھ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اکرم نے سب کچھ دیکھ لیا، وہ دل ہی دل میں

کڑھنے لگا۔ وہ شان کو غصیلی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور ساتھ ساتھ چائے کی چسکی بھی لگا رہا تھا۔ چائے ختم کر کے اکرم، شان کی طرف بڑھا اور ساتھ پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے شان کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ ”کیا بات ہے مجھ سے کوئی ناراضگی ہے آپ کو؟“ ”دیکھو! تم اپنے کام سے کام رکھو۔“ شان نے اس کے ہاتھ سے اپنا کندھا چھڑاتے ہوئے کہا۔ ”میں جتنا تم سے دور رہنے کی کوشش کرتا ہوں تم اتنا ہی مجھ سے قریب آنے کی کوشش کرتے ہو۔“ براہ مہربانی مجھ سے دُور رہا کرو۔“ شان نے ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اکرم سوچ رہا تھا کہ کسی نہ کسی طرح شان کو اپنا دوست بنایا جائے۔ کافی سوچ بچار کے بعد اکرم کے ذہن میں ایک آئیڈیا آیا۔ بہت جلد وہ اپنے اس مشن کو پایہ تکمیل تک پہنچانا چاہتا تھا۔ خیر دوسرے دن اکرم نے صبح دفتر میں یہ واضح اعلان کیا کہ آج ٹی ٹائم کے وقت کوئی بھی کینٹین میں نہیں جائے گا۔ ”کیوں؟“ سب نے حیرانگی سے پوچھا۔ ”کیوں کہ آج ٹی ٹائم میں تمہاری ہلکی پھلکی دعوت کرنے والا ہوں۔“ اکرم

نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر ٹی ٹائم کے وقت اکرم نے تمام آفیسرز کو کینٹین چلنے کے لیے کہا۔ سب تیار ہو گئے مگر شان اپنے کام میں مصروف کمپیوٹر پر کچھ نوٹس تیار کر رہا تھا اور حسب معمول اس نے بھی بہانہ بنایا کہ وہ مصروف ہے اکرم کے چہرے کا رنگ بدلا اور بولا۔ ”یار جس کے لیے میں نے یہ سارا اہتمام کیا ہے وہ موجود نہ ہو تو فائدہ؟ لہذا یہ دعوت دو گھنٹے بعد ہو گی۔“ کینٹین میں سب آفیسرز چائے پی کر نکلے اور دفتر میں کام شروع ہو گیا۔ دو گھنٹے بعد اکرم نے پھر سب کو دعوت کے لیے کہا تو شان کہیں نظر نہ آیا۔ جب وہ ڈھونڈنے پر بھی نہ ملا تو اکرم نے جھٹ سے اس کا نمبر ملایا۔ اس کا نمبر بند ملا۔ اکرم کو کافی غصہ آیا۔ ”عجیب آدمی ہے، اکرم نے اسی کے لیے یہ دعوت لیٹ کی مگر پھر بھی وہ راضی نہ ہوا۔“ ارسلان نے شوارما کھاتے ہوئے کہا۔ تمام آفیسرز دعوت کے مزے بھی لے رہے تھے اور ساتھ ساتھ شان کو بھی کوس رہے تھے۔ ”اس آدمی کا خرہ ہی بہت ہے، ہر وقت نصیحت آموز لیکچر اس کی زبان پر ہوتا ہے۔ یہ ایک قسم کی چلتی پھرتی لاش ہے۔ دفتر کے ماحول کو یہ انسان خراب کر رہا ہے۔“ اکرم غصے میں کہتا چلا گیا اور اسے کچھ پتا ہی نہ چلا کہ شان کب کا آچکا ہے۔ شان نے آتے ہی کہا۔ ”میرے دوستو! میں تھوڑا لیٹ پہنچا کیوں کہ مجھے ایک دعوت کا بلاوا آ گیا تھا۔“ ”یہ بھی تو دعوت ہی تھی، وہاں جانا ضروری تھا؟ کیا وہاں اس سے اعلیٰ پکوان تھے؟ دیکھو یہ شوارما، یہ تکہ بوٹی، یہ

بریانی، یہ چکن۔“ اکرم ایک ایک چیز غصے میں گنوا رہا تھا جب کہ شان خاموشی سے کھڑا دیکھ رہا تھا۔ ”ہاں! وہاں جانا لازمی تھا۔ وہ دعوت اس سے اعلیٰ دعوت تھی اور باقی رہی بات پکوان کی تو پکوان کو نہیں دعوت کے وقت اخلاق کو دیکھا جاتا ہے۔ اگر کوئی خلوص دل سے چٹنی بھی پیش کر دے تو وہ گوشت سے بھی اعلیٰ ہوتی ہے اور اگر کوئی گوشت پیش کرے مگر اس کے درست طریقے سے دعوت نہ دی جائے تو وہ چٹنی سے بھی کم ہوتا ہے۔ میں تمہاری ایک دعوت پر نہیں آیا تو تو اتنا غصہ ہو رہا ہے۔ وہ مالک بھی تو ہمیں پانچ وقت دعوت دیتا ہے مگر ہم ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتے ہیں۔ کیا اللہ ہم پر راضی ہوگا جو ہم ہر روز دن میں پانچ بار اس کی دعوتیں ٹھکراتے ہیں۔ ظہر کی اذان ہوئی تو میں ادھر چلا گیا اور اب یہاں دعوت پر آ گیا۔ بے شک جس دعوت سے میں آ رہا ہوں وہ اس دعوت سے اعلیٰ تھی۔“ اکرم کا سر جھکا ہوا تھا۔ تمام آفیسرز نے کھانا کھانا چھوڑ دیا اور اکرم کو سمجھایا کہ تو بلاوجہ شان کو کوس رہا تھا۔ بے شک شان سیدھی راہ پر تھا۔ خدا اسے استقامت دے۔ اکرم نے معافی مانگی اور پھر شان نے سب کے ساتھ دعوت اڑائی۔ اس دعوت کا مزہ ہی کچھ اور تھا۔ باتوں باتوں میں پتا ہی نہ چلا کہ عصر کی اذان سنائی دی۔ شان نے سب کو دعوت دی۔ سب تیار ہو گئے اور نماز عصر ادا کی۔ بے شک اکرم کی دعوت سے اللہ کی دعوت کئی گنا اچھی اور پر لطف تھی۔

بچوں کی شرارتیں

شرارتیں کرنا تو بچوں کا بے انتہا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ چھوٹی موٹی شرارتیں تو نظر انداز ہونی چاہئیں مگر حد سے زیادہ شریر بچہ گھر، گلی اور مدرسہ میں سب کے لیے باعث تکلیف بن جاتا ہے۔ ننھے بچوں کی اکثر شرارتیں محض کم علمی اور بے شعوری کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ مثلاً نہ جانتے ہوئے کہ سیاہی سے کتابوں پر بدناما داغ پڑ جاتے ہیں، وہ بڑی بے تکلفی سے کتابوں پر دوات انڈیل کر سیاہی بہنے کا تماشا دیکھتے ہیں۔ بعض چھوٹے بچوں کی ننھی منی شرارتوں پر گھر کے بعض بڑے لوگ بہت خوش ہوتے ہیں۔ ان کی ہنسی کو بچہ خراج تحسین سمجھنے لگتا ہے، اور اسے نئی نئی شرارتیں سوچنے لگتی ہیں۔ ایسا بچہ مکتب میں شرارتوں سے سب کے ناک میں دم کر دیتا ہے۔ سزاؤں یا جرمانہ سے بچے کی اصلاح کی امید رکھنا حماقت ہے۔ شرارتی بچے کو تحمل سے مودب کردار کی آسان فہم تعلیم دینی چاہیے۔ اسے اچھے بچوں کی زندگی کے حالات سناتے چاہئیں۔ اسے بتلانا چاہیے کہ یہ بچے آئندہ زندگی میں بڑے رتبے کو اسی لیے پہنچے کہ وہ شرارتیں نہیں کیا کرتے تھے۔ اس میں نیک بچوں کے ساتھ چلنے پھرنے اور کھیلنے کی عادت ڈالنی چاہیے، تاکہ اسے اچھے کردار کو اپنانے کی رغبت محسوس ہو۔ دوسروں کی توجہ اور شفقت کا مرکز بننا بچوں کی بڑی قوی خواہش ہوتی ہے۔ اس کے لیے وہ طرح طرح کے حیلے بہانے بھی گھڑتے رہتے ہیں۔ چیخا چلانا، رونادھونا تو ننھوں کے ڈھنگ ہیں۔ ذرا بڑے بچے ضد اور چھوٹوں پر جبر و تشدد سے اپنا لوہا منوانے کا طریق اختیار کرتے ہیں۔ بچے یہ حرکتیں عموماً والدین کو متوجہ کرنے کے لیے کیا کرتے ہیں۔ ان حرکتوں کو زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہیے۔ اگر آپ اس طرف کوئی خاص توجہ نہ دیں تو بچہ یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ یہ حربہ بھی بے کار ثابت ہوا کیوں کہ میری طرف تو کوئی دیکھتا ہی نہیں۔

سنہرے لوگ



غلام حسین مبین

جہانگیر خان

کے ہاشم خان پہلے فرد ہیں جنہوں نے اسکوائش کے کھیل میں پوری دنیا میں نام روشن کیا۔ بعد میں روشن خان، قمر زمان، طور سم خان نے بھی اس کھیل میں اپنی اجارہ داری قائم رکھی۔ جہانگیر خان سے قبل ان کے والد روشن خان بھی اس کھیل کے عالمی چیمپئن رہے۔

ان کے بڑے بھائی طور سم خان کی خواہش تھی کہ جہانگیر خان کے پاس دو عالمی چیمپئن کا اعزاز ہو۔ وہ اس آرزو کو پوری کرنے کی خواہش کے لیے اسکوائش کی عملی تربیت لیتے رہے۔ پہلی کامیابی انہیں ستمبر 1979ء میں ملی، جب ان کی عمر فقط سولہ سال تھی۔ وہ عالمی شوقیہ چیمپئن شپ جیت چکے تھے، لیکن اس کے ساتھ ہی انہیں ایک سانحے سے دو چار ہونا پڑا جس نے ان کی نفسیات پر گہرا اثر ڈالا۔ ہوا یوں کہ وہ ان دنوں انگلستان میں اپنے بڑے بھائی طور سم خان کے ہمراہ رہتے تھے اور اسکوائش کی پریکٹس جاری رکھے ہوئے تھے۔ ایک روز طور سم خان کو دل کا دورہ پڑا اور وہ 28 سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ یہ جہانگیر خان کے اچھے دوست بھی تھے۔ عملی زندگی کے آغاز میں ایک بھائی جو دوست بھی ہو، کی جدائی ایک گہرا صدمہ ثابت ہوئی مگر جہانگیر خان نے ہمت نہیں ہاری اور وہ بھائی کی خواہش پوری کرنے کا عزم لیے اسکوائش کے کورٹ میں آئے۔

اسکوائش کے کھیل سے آپ سب واقف ہی ہوں گے۔ یہ کھیل ریکش کی ہی چھوٹی شکل ہے۔ اس کھیل کا کودٹ (جہاں کھیلا جاتا ہے) نسبتاً چھوٹا ہوتا ہے۔ یہ مقابلہ عام طور پر دو کھلاڑیوں کے درمیان ہوتا ہے۔

یوں تو اسکوائش کی دنیا پر پاکستان کے کئی کھلاڑیوں نے حکومت کی لیکن ان میں سب سے نمایاں نام جہانگیر خان کا ملتا ہے۔ جہانگیر خان نے 10 اگست 1963ء کو کراچی میں روشن خان کے ہاں آنکھ کھولی۔ ان کے آباء و اجداد کا تعلق پشاور کے نواحی گاؤں نواکلی سے ہے۔ جہانگیر خان کا بچپن میں نام جانسن تھا۔ خیال کیا گیا کہ یہ نام بچے کے لیے بھاری ہے، کیوں کہ وہ اکثر بیمار رہتا تھا۔ چھ سال کی عمر میں ان کا یہ نام تبدیل کر کے بڑے بھائی طور سم خان نے جہانگیر خان رکھ دیا۔ ان کی بیماری کا یہ عالم تھا کہ ہرنیا کی وجہ سے ان کے دو آپریشن ہوئے۔ ایک پانچ سال کی عمر میں اور دوسرا بارہ سال کی عمر میں۔ کراچی میں ہونے والے ان آپریشن کے بعد سرجن نے ان کے والد کو مشورہ دیا کہ بچے کو زندگی میں کوئی سخت کھیل نہ کھیلنے دیا جائے۔

جہانگیر خان کا خاندان اسکوائش کا خاندان ہے۔ اس خاندان

ماہنامہ تعلیم و تربیت

تعلیم و تربیت کا یہ انداز دیکھئے
بچوں کے اس رسالے کا اعزاز دیکھئے
صد شکر کبریا کہ چوتھرواں سال ہے
عزم و عمل کا خوب یہ اعجاز دیکھئے
دل کش کہانیاں ہیں، تصاویر منفرد
نظموں میں ساتھیوں کو ہم آواز دیکھئے
تعلیم و تربیت سے عبارت ورق ورق
مضمون سارے اس کے گل افراز دیکھئے
ہر اک شگوفہ اور پہیلی بھی شان دار
ہر لکھنے والے پہ ہے ہمیں ناز، دیکھئے
جذبہ محبتوں کا ہے بین السطور میں
ہم دم ہے، ہم نوا ہے وہ دم ساز دیکھئے
دیرینہ قارئین میں خود کو بھی ذوالفقار
رب کے کرم سے شاعر ممتاز دیکھئے
سید ذوالفقار حسین نقوی

اور سول اعزاز ”ہلال امتیاز“ دیا۔ انہیں اسپورٹس مین آف دی
ملینیم کا ایوارڈ بھی دیا گیا۔ 1990ء میں جہانگیر خان پروفیشنل
اسکوائش ایسوسی ایشن کے چیئرمین منتخب ہوئے۔ 1997ء میں
پاکستان اور 1998ء میں ورلڈ اسکوائش فیڈریشن کے نائب صدر
منتخب ہوئے۔ 2002ء میں ورلڈ اسکوائش فیڈریشن کے صدر
بنے۔ ٹائم میگزین نے انہیں اپنی ایک اشاعت میں ایشیاء کا ہیرو
قرار دیا۔ لندن میٹرو پول یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی کی اعزازی
ڈگری دی۔ کینیڈا کے ایک عالمی ادارے نے ”دی کنکرز“ (فاتح)
کے نام سے ایک فلم بھی بنائی۔ پاکستان کے محکمہ ڈاک نے ان پر
یادگاری ٹکٹ بھی جاری کیا۔ ☆☆

ان کی جانب سے پہلا بڑا دھماکہ نومبر 1981ء کو ہوا جب
انہوں نے ورلڈ اوپن چیمپئن شپ میں آسٹریلیا کے جیف ہنٹ کو
ہرایا۔ اس وقت جہانگیر خان کی عمر 18 سال تھی۔ ساری دنیا میں
ان کی کامیابی کے ڈنکے بجنے لگے اور انہیں ونڈر بوائے (اسکوائش
میں عزت والا مرتبہ) قرار دیا گیا۔ جیف ہنٹ نے ایک سال بعد
ہی اسکوائش سے ریٹائرمنٹ لے لی۔

اب پاکستان کا یہ سپرٹ فتوحات کے طویل سفر پر نکلا اور اپنے
سولہ سالہ کیریئر میں چھ مرتبہ عالمی چیمپئن شپ جیتی۔ گینر بک آف
ورلڈ ریکارڈ میں درج ایک اور ناقابل تسخیر ریکارڈ پاکستان کے اس
سپرٹ کے نام ہے کہ اس نے دس سال تک مسلسل برٹش اوپن
چیمپئن شپ جیسا عظیم انٹرنیشنل اعزاز لگاتار جیت کر اپنے نام کیا۔

- ☆ پہلی کامیابی 1982ء مد مقابل ہدایت خان (پاکستان)
- ☆ دوسری کامیابی 1983ء گمال عواد (Gamal Awad) (مصر)
- ☆ تیسری کامیابی 1984ء قمر الزماں (پاکستان)
- ☆ چوتھی کامیابی 1985ء کرس ڈٹمار (آسٹریلیا)
- ☆ پانچویں کامیابی 1986ء راس نارمن (نیوزی لینڈ)
- ☆ چھٹی کامیابی 1987ء جان شیرخان (پاکستان)
- ☆ ساتویں کامیابی 1988ء روڈنی مارٹن (آسٹریلیا)
- ☆ آٹھویں کامیابی 1989ء روڈنی مارٹن (آسٹریلیا)
- ☆ نویں کامیابی 1990ء روڈنی مارٹن (آسٹریلیا)
- ☆ دسویں کامیابی 1991ء جان شیرخان (پاکستان)

جہانگیر خان نہ صرف سافٹ بال اسکوائش کے چیمپئن رہے
بلکہ وہ امریکا میں کھیلی جانے والی اسکوائش کی مقبول قسم ہارڈ بال
کے بھی عالمی چیمپئن رہے۔ انہوں نے 1983ء سے 1986ء
کے دورانیہ میں ہارڈ بال کے تیرہ بڑے ٹورنامنٹ میں حصہ لیا جن
میں سے بارہ میں کامیابی ان کا مقدر بنی۔ صرف ایک بار مارک
ٹیل بوٹ سے شکست کھائی۔ جہانگیر خان نے 1994ء میں تیس
سال کی عمر میں اسکوائش سے ریٹائرمنٹ لے لی۔

ان ڈھیروں اعزازات کے ساتھ ساتھ ملکی اور بین الاقوامی سطح
پر ان کی خدمات کا اعتراف کیا گیا۔ حکومت پاکستان نے انہیں
صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی (Pride of Performance)

(حرافط، گوجرانوالہ)

بہت اچھے تھے۔

☆ آپ کے لیے ڈھیروں دعائیں۔

میں ایک سال سے تعلیم و تربیت پڑھ رہا ہوں۔ اس میں ہر چیز بہت بہتر ہوتی ہے۔ نیا ناول بہت اچھا ہے تعلیم و تربیت کی ٹیم میں شامل کر کے شکریہ کا موقع لینا چاہتا ہوں۔ (محمد صہیب، شیدو)

☆ آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔

میں ایک سال سے تعلیم و تربیت پڑھ رہی ہوں۔ اب چوتھی جماعت میں ہوں۔ میں سالانہ امتحان میں اول آئی ہوں۔ یہ رسالہ بہت اچھا ہے۔ ہر مہینے اخبار والے کا بہت انتظار رہتا ہے۔ میں پہلی دفعہ خط لکھ رہی ہوں۔ کیا میں انگلش میں کہانی لکھ سکتی ہوں اور میری لکھائی کیسی ہے؟ (عائشہ ارم، ڈھوک پراچہ)

☆ آپ نے بہت پیارا خط لکھا ہے۔ اردو کی کہانی بھیجیں۔ لکھائی صاف ستھری ہے لیکن بہتری کی ابھی بہت گنجائش ہے۔

مجھے تعلیم و تربیت بہت پسند ہے اور میں بہت پیار سے پڑھتی ہوں۔ یہ میرا دوسرا خط ہے۔ میں امتحان میں اول آئی ہوں۔ تعلیم و تربیت بچوں کا محبوب رسالہ ہے۔ (حفصہ اعجاز، صوابی)

میں خیریت سے ہوں اور آپ کی خیریت کے لیے دعا گو ہوں۔ میری عمر 15 سال ہے۔ میں کافی عرصے سے تعلیم و تربیت پڑھ رہی ہوں۔ میں خاموش قاری ہوں اور اب چپ کا روزہ توڑ کر خط لکھ رہی ہوں۔ صحابہ کرام کے بارے میں معلومات بھیج رہی ہوں۔ میری حوصلہ افزائی کیجئے گا۔ (علیہ حیدر، اسلام آباد)

آپ کو شاید حیرانی ہو کہ میں نے 1990ء سے اب تک تعلیم و تربیت کے تمام شمارے پڑھ لیے ہیں جو میں نے اپنے کزنز سے لیے تھے۔ وہ بھی اس کے قارئین رہ چکے ہیں۔ اپریل کا شمارہ زبردست تھا۔ ناول بھی کافی دل چسپ ہے۔ (طوبی وحید، ہری پور)

میں ہشتم میں پڑھتا ہوں۔ ایک سال سے تعلیم و تربیت پڑھ رہا ہوں۔ یہ میرا پہلا خط ہے۔ ناول دولت پور میں بہت پسند آیا۔ تعلیم و تربیت کے شائع ہونے کی تاریخ کیا ہے؟ (محمد ارسلان، تلہ گنگ)

☆ ڈیئر ارسلان! ہر شمارہ ایک ماہ پیشگی تیار کر لیا جاتا ہے۔

ہر بار کی طرح اپریل کا شمارہ بھی زبردست تھا۔ میں کچھ تحریریں بھیج رہی ہوں۔ ضرور شائع کیجئے گا، ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گی۔

☆ ہونہار مصور میں پرنسپل کا نام لکھنا ضروری نہیں۔ آپ کا خط



میں شیرہ جاوید گوجرانوالہ سے معذرت خواہ ہوں کہ میں کئی ماہ سے تعلیم و تربیت میں شرکت نہ کر سکی۔ میرے آٹھویں کے سہ ماہی امتحان ہو رہے تھے۔ خیر چھوڑیے جب بھی میرا نام تعلیم و تربیت میں آتا ہے تو میرے اساتذہ اور پرنسپل بہت خوش ہوتے ہیں اور مجھے سراہتے ہیں اور مجھے مزید محنت کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اپریل کا شمارہ عروج پر تھا۔ برائی کی موت، دوسری زندگی بہت ہی اچھی کہانیاں تھیں۔ تعلیم و تربیت بہت حسین و جمیل لگ رہا تھا۔ اجازت چاہتی ہوں۔

☆ آپ کا خط بہت خوب صورت اور رنگوں سے سجا ہوا ہے۔ آپ کا خط پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔

آپ کا رسالہ بہت دیر سے ملتا ہے جس کی وجہ سے میں رسالے کے سلسلوں میں حصہ نہیں لے سکتا۔ میں رسالے کا نیا قاری ہوں۔ (رانا بلال احمد، کوئلہ جام)

☆ رانا بلال! ہم کوشش کریں گے کہ تعلیم و تربیت آپ کو وقت پر ملے۔ میں دو سال سے تعلیم و تربیت کا قاری ہوں۔ ہمارے گھر میں سب لوگ بے صبری سے انتظار کرتے ہیں اور شوق سے پڑھتے ہیں۔ اپریل کے شمارے میں تمام کہانیاں بہترین تھیں۔ محاورہ کہانی، مختصر مختصر اور ذائقہ کارنر اچھے لگے۔ ان سلسلوں کو جاری رکھیے گا۔ ان سے ہمیں بہت سی معلومات ملتی ہیں۔

(عبیرہ ندیم، محمد حمزہ، آمنہ ندیم، اسلام آباد)

میں نے پہلے بھی خط لکھا تھا لیکن شائع نہیں ہوا۔ میرا خط ضرور شائع کریں۔ آپ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے زندگی کے مقصد میں کامیاب کرے۔ اس بار فضل بن کر چیو، برائی کی موت، اور ناول

بہت خوب صورت ہے۔ شکریہ!

پچھلے ماہ شاید آپ کو میرا خط دیر سے موصول ہوا۔ اب میں وقت پر بھیج رہی ہوں۔ اپریل کا شمارہ بہت اچھا لگا۔ علامہ اقبال کے بارے میں اضافی معلومات پڑھ کر بہت مزا آیا۔ مزید برآں کہانیاں ہمیشہ کی طرح بہت عمدہ تھیں۔ میرے لیے دعا کیجئے گا کہ میرے کیمبرج کے امتحان اچھے ہوں۔ شمارے کا سرورق بھی بہت پسند آیا۔ چیف ایڈیٹر عبدالسلام کے انتقال کا بہت افسوس ہوا۔

(منابل افضل، لاہور)

☆ منابل افضل ہماری بہت پیاری اور ہونہار قاری ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور تمام طلباء و طالبات کو امتحان میں کامیاب کرے۔ آمین! ڈیر ایڈیٹر! میں کئی بار خط لکھ چکی ہوں لیکن شائع نہیں ہوتے۔ برائے مہربانی اس بار شائع کریں۔ میں نے تمام سلسلوں میں حصہ لیا ہے۔ میں سالانہ امتحان میں دوم رہی ہوں۔ مجھے مبارک باد ضرور دیں۔ میرا بلا عنوان بھی شائع کریں۔ (عروب ملک، لاہور)

☆ ڈیر عروب! آپ کو بہت بہت مبارک قبول ہو۔ اللہ آپ کو مزید کامیابیاں عطا فرمائے۔ آمین!

خوش رہیں، آباد رہیں۔ انعام موصول ہوا، بہت بہت شکریہ۔ کیا میں آپ کو منظوم نظم بھیج سکتی ہوں؟ تعلیم و تربیت بہت دیر سے ملتا ہے۔ اخبار والے انکل کہتے ہیں کہ آتا ہی دیر سے ہے۔ جب ملے گا، تب ہی لے کر آؤں گا۔ (عزیز سلیم وفا، سیال کوٹ)

السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟ گزشتہ شمارہ پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ ہر کہانی ہر سلسلہ پر فیکٹ تھا۔ براہ مہربانی شطرنج پر کچھ شائع کریں۔ میری دعا ہے کہ یہ ہمیشہ اسی طرح ہنستا کھلکھلاتا رہے۔

(حافظ محمد فرخ حیات، پیر محل)

☆ آپ کی شمولیت بہت دیر بعد ہوئی ہے۔ امید ہے اب باقاعدگی سے شرکت کریں گے۔

آپ کا کیا حال ہے؟ اپریل کا شمارہ ہر بار کی طرح زبردست تھا۔ اس بار پہلا صفحہ بہت ہی خوب صورت تھا۔ میں پیپرز کی وجہ سے خط نہیں لکھ پائی۔ جناب عبدالسلام کی وفات کا سن کر بہت افسوس ہوا۔ میں نے فائل ٹرم میں 84 فیصد نمبر لیے ہیں۔ نیا سلسلہ ”میری بیاض سے“ میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیں گے۔

☆ ڈیر افراح! تعریف کا شکریہ! رابطہ رکھیے گا۔

میں گزشتہ 3 سال سے تعلیم و تربیت پڑھ رہا ہوں۔ ان شاء اللہ آگے بھی اس کا ساتھ رہے گا۔ فضل بن کر جیو، دل چسپ اور سبق آموز کہانی تھی۔ مئی کے شمارے میں میری کوئی تحریر شائع کریں۔ (صبا شوکت، گوجرانوالہ)

☆ پیاری صبا! جلد ہی آپ کی تحریر شائع ہوگی۔ اچھے بچے روٹھتے نہیں ہیں۔

☆ محمد شاہد جمعہ آپ نے اپنے شہر کا نام نہیں لکھا۔

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ تعلیم و تربیت زبردست اور لا جواب تھا۔ مارچ میں میرا خط شائع ہوا۔ بچوں نے پھر سلام بھیجا ہے۔ تعلیم و تربیت ہمارے گھروں میں ہی نہیں بلکہ ہمارے دلوں میں بھی ہیں۔

☆ شکریہ! آپ سب بچے بھی تعلیم و تربیت کے چمن کے خوش نما پھولوں کی طرح ہیں۔

میں دو سال سے تعلیم و تربیت پڑھ رہا ہوں۔ پچھلے امتحان کی وجہ سے سلسلوں میں حصہ نہیں لے سکا۔ میں نے اپنے اسکول میں ٹاپ کیا ہے۔ پلیز میرا خط شائع کریں۔ (سلیمان علی اعوان، واہ کینٹ)

☆ ڈیر سلیمان! آپ کو بہت بہت مبارک ہو۔

میں بچپن سے آپ کا رسالہ بہت شوق سے پڑھ رہا ہوں۔ یہ ایک اصلاحی رسالہ ہے۔ اس کے تمام سلسلے مجھے پسند ہیں۔

(حذیفہ جاوید، جھنگ)

رسالہ ہاتھ میں آتا ہے تو سب سے پہلے کھوج لگائیے کا صفحہ پڑھتا ہوں۔ اس ماہ میرے امتحان ہیں، دعا کیجئے گا۔ (طلحہ فاروق، راول پنڈی)

☆ آپ کے لیے بہت سی دعائیں۔

امید کرتی ہوں کہ آپ بالکل فٹ فٹ اور مزے میں ہوں گے۔ سب سے پہلے معذرت کہ بورڈ کے امتحان کی وجہ سے آپ کو خط لکھ نہ سکی۔ اب کچھ بات کرتے ہیں اپریل کے شمارے کی۔ سرورق اپنی مثال آپ تھا۔ کہانیاں ہمیشہ کی طرح سبق آموز تھیں۔ فضل بن کر جیو اچھی لگی۔ ناول بھی اچھا جا رہا ہے۔ چھاپہ خانہ کے متعلق پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ اب آپ سے اجازت چاہوں گی۔ اگلے ماہ پھر نصف ملاقات ہوگی۔ (کرن فاروق، گوجرانوالہ)

☆ پیارا سا خط لکھنے کا شکریہ۔

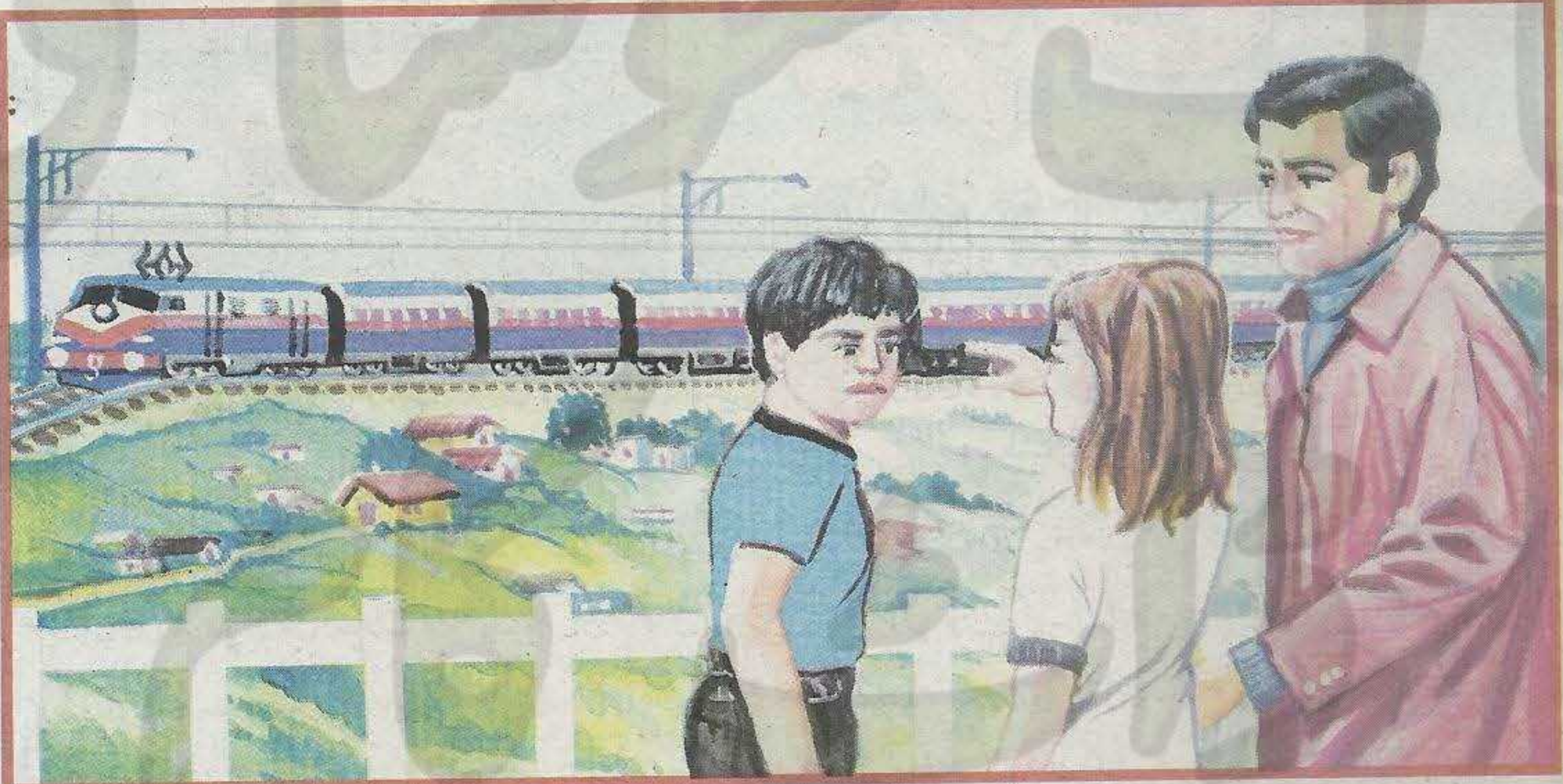
کھوج لگائیے!

ذہانت آزمائیں اور 500 روپے کی کتابوں کا انعام پائیں۔



عالیہ اور نبیل کا اسکول گھر سے کچھ ہی دور تھا۔ وہ پیدل ہی چل کر اسکول جایا کرتے تھے۔ راستے میں انہیں ریلوے لائن کرنا پڑتی تھی۔ جب دور سے ریل گاڑی شور مچاتی اور دھواں اڑاتی نظر آتی تو وہ بڑے اشتیاق اور دل چسپی سے ریل گاڑی کو دیکھتے۔ آج ان کے ماموں علی رضا بھی ان کے ساتھ تھے جو کچھ دن پہلے جاپان سے آئے تھے۔ وہ انہیں جاپان کی ترقی اور وہاں کے ریلوے کے نظام کے بارے میں بھی بتاتے جا رہے تھے۔ جب دور سے ریل گاڑی کی آواز آئی تو وہ سب ایک طرف کھڑے ہو کر ریل گاڑی گزرنے کا انتظار کرنے لگے۔ راستے میں ماموں جان نے ان سے ایک سوال پوچھا: ”پیارے بچو! ایک الیکٹرک ٹرین 40 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جنوب کی جانب جا رہی ہے اور 60 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے شمال کی جانب چلتی ہے۔ بتاؤ! ٹرین کا دھواں کس سمت میں جائے گا؟

پیارے بچو! آپ تھوڑا سا ذہن پر زور ڈالیں اور جواب لکھ کر بھیجیں۔



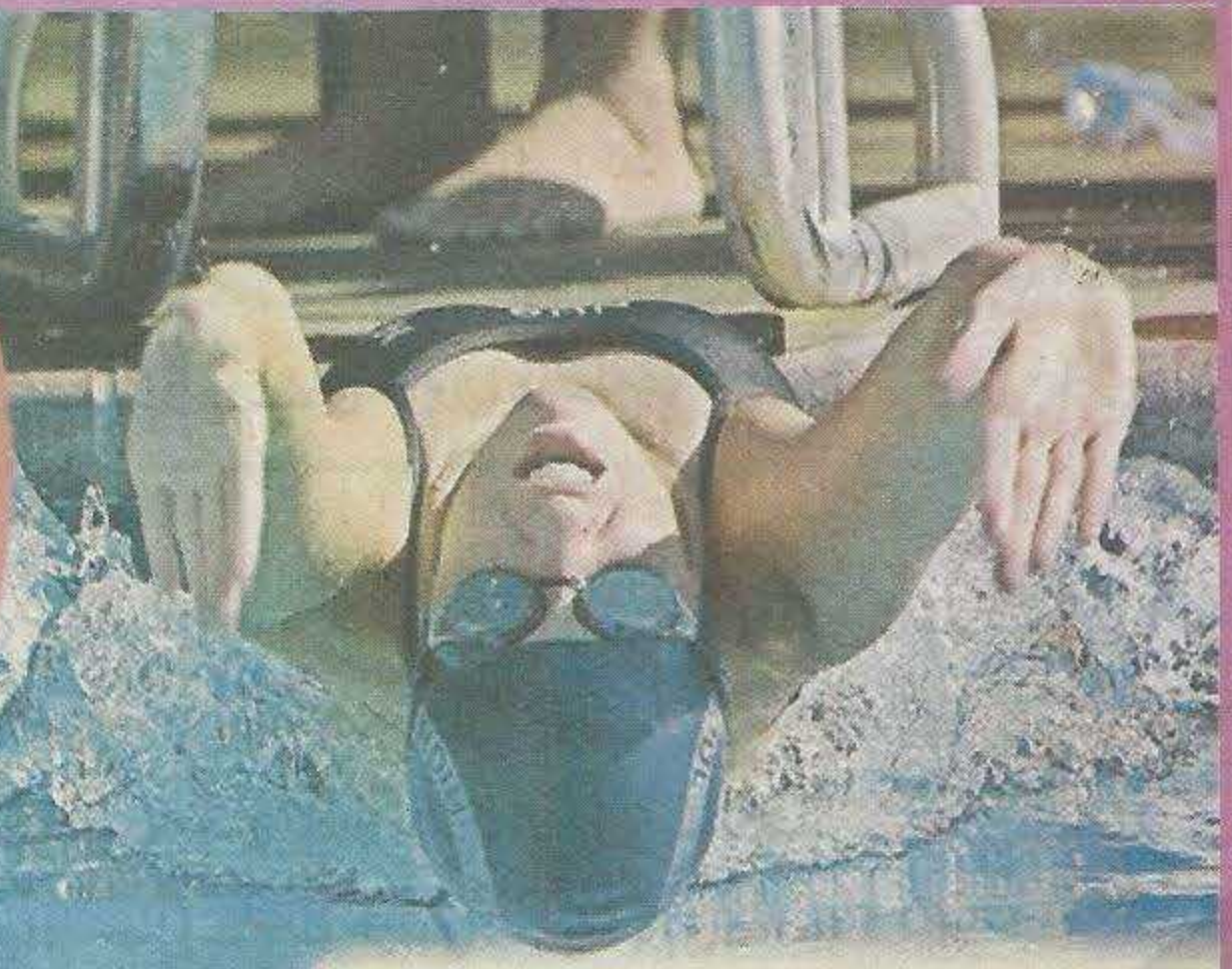
اپریل 2014ء میں شائع ہونے والے ”کھوج لگائیے“ کا صحیح جواب یہ ہے:

سارہ اور طارق نے کیل کے ذریعے ٹائر کی ہوا نکالی اور گاڑی کو پل کے نیچے سے نکالا۔

اپریل 2014ء کے کھوج لگائیے میں قرعہ اندازی کے ذریعے درج ذیل بچے انعام کے حق دار قرار پائے ہیں:

- 1- بلال ذوالفقار سلیمانی، کراچی
- 2- صفارشید، کراچی
- 3- محمد عمر عطا قادری، کاموکی
- 4- آمنہ عامر، فیصل آباد
- 5- آمنہ ندیم، اسلام آباد

نسرین شاہین



تیراکی

پانی کا مقبیل ترین کھیل



1908ء کا سال تیراکی کے لیے اس لیے بھی یادگار تھا کہ لندن اولمپکس میں پہلی بار تیراکی کے مقابلے سوئمنگ پول میں منعقد ہوئے اور یہ سوئمنگ پول لندن کے وہارٹ سٹی اسٹیڈیم کے وسط میں تیار کیا گیا۔ اس سوئمنگ پول کی لمبائی 100 میٹر تھی۔ پھر 1924ء کے پیرس اولمپکس میں سوئمنگ پول کی طوالت کو فینا کے نئے قوانین کے تحت 50 میٹر کر دیا گیا۔ 1948ء کے ساتویں اولمپکس میں جو لندن میں ہوئے، شائقین نے پہلی بار تیراکی کے مقابلے، ان ڈور سوئمنگ پول میں بیٹھ کر دیکھے تھے جب کہ 1912ء میں اسٹاک ہوم اولمپکس میں پہلی بار خواتین کی تیراکی کے مقابلے کا آغاز ہوا۔ یہاں خواتین کے دو ایونٹس 100 میٹر فری اسٹائل اور 4x100 میٹر فری اسٹائل مقابلے پروگرام کا حصہ تھے۔ مردوں کے ساتھ ساتھ تیراکی خواتین کا بھی پسندیدہ کھیل بن چکا ہے۔

دنیا بھر میں کھیلوں کے جو مقابلے ہوتے ہیں جن میں اولمپکس اور دیگر گیمز عالمی چیمپئن شپ اور عالمی کپ کے مقابلے شامل ہیں،

پانی کے کھیلوں میں تیراکی کو بہت مقبولیت حاصل ہے۔ یہ ایک کھیل ہی نہیں، تفریح بھی ہے اور ورزش بھی۔ تیراکی ایک ایسی جسمانی و ذہنی ورزش ہے جو تمام اعضاء پر مثبت اثرات مرتب کرتی ہے۔ اس کو بطور کھیل پہلی بار جاپان میں متعارف کرایا گیا۔ پھر بین الاقوامی سطح پر امریکی تیراکوں نے سب سے نمایاں کامیابیاں حاصل کیں۔ آج تیراکی کے شائقین اور کھلاڑی دنیا بھر میں موجود ہیں۔

تیراکی کے کھیل کی ابتدا پر نظر ڈالی جائے تو پتا چلتا ہے کہ تیراکی کے کھیل کو باقاعدہ منظم کرنے کے لیے 1908ء میں لندن میں عالمی تیراکی فیڈریشن (فینا) قائم کی گئی۔ اس تنظیم نے عالمی سطح پر نہ صرف تیراکی کی باقاعدہ سرپرستی کی بلکہ پانی سے متعلق مزید دو کھیلوں، غوطہ زنی (ڈائیونگ) اور واٹر پولو کے امور کو طے کرنے کی ذمہ داری بھی سنبھالی۔ تیراکی کے عالمی مقابلوں کا آغاز پہلے جدید اولمپک کھیلوں 1896ء میں ایتھنز (یونان) سے ہوا اور 1908ء کے لندن اولمپکس میں تیراکی کے مقابلے اس تنظیم کی زیر نگرانی منعقد ہونے والے پہلے مقابلے تھے۔

ان مقابلوں میں تیراکی کی اقسام اور ان کے ایونٹس، ان کا طریقہ کار وغیرہ کے بارے میں جاننا بھی ضروری ہے۔ بین الاقوامی سطح پر تیراکی میں فری اسٹائل ٹیم کی شکل میں میڈلے، ریلے، بیک اسٹروک، بریسٹ اسٹروک، بٹر فلائی اسٹروک اور تیراکی کی سب سے خوبصورت قسم سینکرو نائزنگ کے مقابلے دیکھے جاتے ہیں۔ ان کی تفصیل اس طرح ہے۔

○ **فری اسٹائل:** عالمی تیراکی کی تنظیم (فینا) کا قانون ”ایس ڈبلیو فائیو“ فری اسٹائل تیراکی سے متعلق ہے۔ سوئمنگ کے ان مقابلوں میں حصہ لینے کے لیے کوئی مخصوص اسٹائل وضع نہیں کیا گیا۔ یہ تیراکی کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ جو اسٹائل پسند کرے۔ اس میں مطلوبہ فاصلہ طے کرے۔ یہ بات مد نظر رکھی جانی چاہیے کہ وہ اسٹائل تیراکی کے دیگر اسٹائل سے ملتا جلتا نہ ہو۔ فاصلہ طے کرنے کے دوران تیراکی سوئمنگ پول کی دیواروں کو چھو سکتا ہے۔ مرد اور خواتین تیراکوں کے لیے فری اسٹائل میں 50, 100, 200 اور 400 میٹر میں مقابلے ہوتے ہیں جب کہ صرف مردوں کے لیے 1500 میٹر میں اور صرف خواتین کے 800 میٹر کے مقابلے بھی پروگرام کا حصہ ہوتے ہیں۔

○ **بیک اسٹروک:** بیک اسٹروک تیراکی میں ایک تیراک کمر کے بل پانی میں کود کر مقابلے کا آغاز کرتا ہے۔ مقابلے کی ابتدا کے لیے تیراک سوئمنگ پول کے ابتدائی کنارے پر اپنی اپنی لائنوں میں موجود مقابلے سے پہلے کنارے پر لگی ہوئی رکاوٹ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑتے ہیں۔ اس دوران ان کا رخ سوئمنگ پول کے ابتدائی کنارے کی جانب ہوتا ہے جب کہ ان کے دونوں پاؤں پانی کے اندر دیوار کے ساتھ لگے ہوتے ہیں۔ ابتدائی سگنل ملنے سے پہلے کسی تیراک کو حرکت کرنے کی اجازت نہیں ہوتی ہے۔ فینا کے قانون ایس ڈبلیو 2-6 کے مطابق تیراک مقابلے کے آغاز کا سگنل ملتے ہی اپنے آپ کو کمر کے ذریعے پیچھے دھکیلنے کے بعد مقابلہ شروع کرتا ہے۔ تمام مقابلے میں تیراک کمر کے بل تیر کر فاصلہ طے کرتا ہے۔ تیراکی کا ایک قانون ایس ڈبلیو 3-6 بھی ہے۔

قانون ایس ڈبلیو 3-6 کے مطابق اگر تیراک قصداً مقابلے کے

دوران فاصلہ طے کرتے ہوئے سوئمنگ پول میں کناروں سے مڑتے ہوئے اپنے جسم کے حصوں جن میں اس کا سر، بازو، ہاتھ کے نیچے اور کہنی شامل ہے، اس کی مدد لے تو وہ مقابلے سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ یہ صورت دیگر غیر ارادی طور پر کسی تیراک کا ان حصوں میں سے کوئی حصہ کناروں کو چھو جائے تو وہ اس قانون سے آزاد ہوگا۔ بیک اسٹروک تیراکی میں تیراک کی ٹانگوں کی حرکت کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ اس دوران تیراک فلوٹر کک کا استعمال کرتے ہوئے پیچھے کی طرف فاصلہ طے کرتا ہے۔ کمر کو پانی کی سطح پر رکھتے ہوئے تیراک اپنے بازوؤں کو پہلے اوپر کی طرف اور پھر پیچھے کی طرف یکے بعد دیگرے پورا گھماتا ہے اور ساتھ ہی اپنی ٹانگوں کو افقی سمت میں رکھتے ہوئے بہت تیزی سے اوپر نیچے حرکت دیتا ہے اور ایڑی کی مدد سے پیچھے کی طرف جاتا ہے۔ تیراکی کے اس اسٹائل میں تیراک کو فاصلہ طے کرنے کے لیے سب سے زیادہ وقت درکار ہوتا ہے۔ مردوں اور خواتین کے لیے اس اسٹائل میں 100 میٹر اور 200 میٹر کے فاصلے کے مقابلے ہوتے ہیں۔

○ **بریسٹ اسٹروک:** بریسٹ اسٹروک تیراکی میں تیراک کی چھاتی کا اصل کردار ہوتا ہے۔ تیراکی کے عالمی قوانین کے مطابق بریسٹ اسٹروک تیراکی کے مقابلے کے آغاز کے ساتھ ہی تیراک کے پانی میں بازو کی پہلی ضرب کے ساتھ اور ہر ٹرن کے بعد تیراک کا پورا جسم اس کے سینے کی مرکزی حرکت پر آگے بڑھتا ہے۔ اس دوران تیراک کے دونوں کاندھے ایک خط میں پانی کی تمام سطح پر رہتے ہیں۔ اس کے ساتھ تیراک اپنے چہرے کو پانی کی سطح پر بالکل سیدھا رکھتے ہوئے بہت قوت کے ساتھ تیزی سے غوطہ دیتے ہوئے آگے بڑھتا ہے۔ بریسٹ اسٹروک تیراکی میں تیراک کے بازوؤں اور سینے کی مخصوص حرکت کے ساتھ اس کی ٹانگوں کی خاص حرکت کا بھی دخل ہوتا ہے۔

پیراک ٹانگوں کی حرکت کے دوران مختلف کک استعمال کرتا ہے۔ وہ اپنی ٹانگوں کو پہلے گھٹنوں پر باہر کی طرف جھکاتا ہے اور بعد میں ان کو پھیلاتا ہے اور اسی شکل میں ان کو آگے لے جاتے ہوئے آپس میں یک جا کر دیتا ہے۔ ہاتھ اور ٹانگوں کے ساتھ سر، چھاتی اور چہرے

200 میٹر میں دونوں کے لیے ہوتے ہیں۔

○ **میڈلے تیراکی:** چار مختلف اقسام فری اسٹائل، بیک اسٹروک، بریسٹ اسٹروک اور بٹر فلائی اسٹروک کا امتزاج ہے۔ اس تیراکی کا ماہر آل راؤنڈر تیراک کہلاتا ہے۔ مقابلے کے دوران ایک تیراک ان چاروں اسٹروکس کو استعمال کرنے کا پابند ہوتا ہے۔ میڈلے تیراکی کے مقابلے 200 میٹر اور 400 میٹر میں انفرادی طور پر اور اجتماعی مقابلے ہوتے ہیں، جن میں ایک ملک سے چار تیراکوں کی ٹیم مقابلوں میں حصہ لیتی ہے۔ یہ مقابلے 4x100 میٹر کے لیے ہوتے ہیں۔ انفرادی طور پر مقابلوں میں تیراک کو 200 میٹر میں ہر اسٹروک 50 میٹر تک اور 400 میٹر میں ہر اسٹروک 100 میٹر تک جاری رکھنا لازمی ہوتا ہے۔ مقابلے کے دوران تیراک چاروں اسٹروکس ضابطے کے مطابق ترتیب کے ساتھ استعمال کرتا ہے۔ مقابلے کا آغاز بٹر فلائی اسٹروک سے ہوتا ہے۔

فری اسٹائل ریلے میں تیراک اپنی مرضی کے مطابق مطلوبہ فاصلہ طے کر سکتے ہیں۔ 4x100 میٹر میں ٹیم کا ہر رکن 100 میٹر کا فاصلہ اور 4x200 میٹر میں ٹیم کا ہر رکن 200 میٹر کا فاصلہ طے کرتا ہے۔ سینکرو نائزڈ تیراکی کا یہ اسٹائل تیراکوں کی سوئمنگ پول میں خوب صورت انداز میں مہارت کے لیے دنیا بھر میں مقبول ہے۔

کے یہ تمام عوامل ایک وقت میں ہوتے ہیں۔ ٹانگوں کی حرکت یعنی کک کو اصطلاحاً فلوٹر کک، فراگ کک اور اوٹو کک کہتے ہیں۔ فینا کے قوانین ایس ڈبلیو 4-7 اور 5-7 ٹانگوں کی حرکت کی پابندیوں سے متعلق ہیں۔ اس اسٹائل میں بھی مرد اور خواتین تیراکوں کے لیے 100 میٹر اور 200 میٹر فاصلے میں مقابلے ہوتے ہیں۔

○ **بٹر فلائی اسٹروک:** بٹر فلائی اسٹروک تیراکی کا طریقہ کار تقریباً وہی ہے جو بریسٹ اسٹروک میں استعمال ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس اسٹائل کے بیشتر قوانین بریسٹ اسٹروک تیراکی میں بھی نظر آتے ہیں جب کہ چند قوانین صرف بٹر فلائی اسٹروک کے لیے ہی ہیں جن میں تیراک بٹر فلائی اسٹروک میں مقابلے کے آغاز کے ساتھ اس بات کا پابند ہوتا ہے کہ وہ دوران مقابلہ اپنے دونوں بازو پانی کی سطح کے اوپر رکھتے ہوئے آگے کی طرف ضرب لگائے اور اسی حالت میں ان کو واپس پیچھے کی طرف لائے گا۔ تیراک اپنے دونوں بازوؤں کو پورا کھولتے ہوئے ان کو اوپر کی طرف ایک ساتھ ضرب لگاتا ہے اور آگے بڑھتا ہے اور ساتھ ہی وہ اپنی ٹانگوں کو اپنی ایڑیوں کی مدد سے بہت پھرتی سے اوپر نیچے حرکت دیتا ہے۔ یہ عمل تیراک کے تیزی سے آگے بڑھنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ اس اسٹائل میں بھی مقابلے 100 میٹر اور

”کھوج لگائیے“ میں حصہ لینے والے بچوں کے نام

حافظ محمد خرم سیفی، گوجرانوالہ۔ محمد انیق شاہ، کوہاٹ۔ خرم اقبال، سرگودھا۔ رانا بلال احمد، بھکر۔ مڈر لطیف، گوجرانوالہ۔ آمنہ نسیم، ایبٹ آباد۔ جویریہ ماہ نور، فیصل آباد۔ نبیہ جمیل، لاہور۔ اسامہ زاہد، کراچی۔ عائشہ مجید لاہور۔ مریم صدیقہ راجپوت، گوجرانوالہ۔ سید زین العابدین، گجرات۔ محمد سلمان شاہد، کراچی۔ حائقہ عزیز، ڈیرہ اسماعیل خان۔ تطہیر زارا، میرپور، آزاد کشمیر۔ حمزہ عدنان، لاہور۔ ہمایوں رشید، اسلام آباد۔ حافظ محمد اورنگزیب، لاہور۔ محمد فصیح الرحمن، ملتان۔ زینب ناصر، فیصل آباد۔ محمد بلال طاہر، جھنگ۔ اسامہ زاہد، کراچی۔ ملائکہ اعجاز، راول پنڈی۔ عائشہ صدیقہ، ٹمن۔ طلحہ اعجاز، باڑہ ہملٹ۔ تحریم مریم شاہد، ملتان۔ مریم بخاری۔ ام معبد، شیخوپورہ۔ زینب ذوالفقار، فہد امین، گوجرانوالہ۔ آمنہ بی بی، محمد حذیفہ، راول پنڈی۔ مسرت فراز، کراچی۔ رابیکا شاہد شیخ، گوجرانوالہ۔ امان الہی خان، فیصل آباد۔ سلیمان علی اعوان، واہ کینٹ۔ محمد قمر الزمان، مٹھ ٹوانہ۔ عاصم طفیل، گوجرانوالہ۔ محمد احمد خان غوری، بہاول پور۔ محمد حسان، راول پنڈی۔ سرمد خوشنود الہی، گوجرخان۔ محمد حسن اعجاز، بہاول پور۔ خدیجہ فہد، عنایہ فہد، گوجرانوالہ۔ حافظ محمد حذیفہ جاوید، جھنگ۔ حرا بتول، فیصل آباد۔ محمد ثاقب، چکی شیخ۔ شوال فاطمہ، شیخوپورہ۔ حافظ محمد عاقب، گجرات۔ مہر اکرم، لاہور۔ شاہ میر شاہد، شیخوپورہ۔ زینب محمود، گوجرانوالہ۔ علیہ احمد، اشرف تواب، طلحہ فاروق، راول پنڈی۔ محمد حظلہ سعید، فیصل آباد۔ محمد حمزہ سعید، بورے والا۔ ☆☆

نیپال کی ایک لوک کہانی

احمد عدنان طارق



بیماری

لگتا تھا کہ دونوں نے ایک دوسرے کو ماں بیٹا صرف رسماً نہیں کہا تھا بلکہ دل سے وہ اس رشتے کو مان رہے تھے۔ سوکومار دوبارہ بانسری بجانے لگا۔ ”تو پھر میرے ساتھ آ جاؤ، دیکھو! تمہاری بہن تجھے بلا رہی ہے، میں نے تمہاری بانسری کی دھن سنی تو مجھے ایسے لگا جیسے تم مجھے بلا رہے ہو۔ آؤ ہمیں گھر چلنا چاہیے۔“ عورت نے سوکومار کو کہا تو سوکومار نے بانسری اپنے نیپے میں اڑسی اور عورت کے پیچھے اس کے گھر کی طرف ہو لیا۔ سوکومار صرف پانچ سال کا تھا جب سوکومار کی والدہ کا انتقال ہوا تھا۔ سوکومار کو صرف اس کی روشن آنکھیں اور گلے میں پہنی نیلے موتیوں کی مالا یاد تھی۔ اسے یقین تھا کہ اس کی ماں اس کے دل میں آج بھی زندہ ہے۔ اس کی بانسری اسے اس کے باپ نے تحفے میں دی تھی۔ اس کی ماں کے مرنے کے بعد اکثر اس کا باپ اپنی بانسری بجایا کرتا تھا، خاص طور پر جب اس کے سونے کا وقت ہوتا اور بانسری کی خوب صورت آواز سے سوکومار بھی نیند کی آغوش میں چلا جاتا۔

ایک دن سوکومار نے سونے سے پہلے اپنے باپ سے اپنی ماں کے بارے میں پوچھا تو اس کے باپ نے بانسری ایک طرف رکھ دی اور ڈبڈبائی نظروں سے سوکومار کو سمجھانے لگا کہ اس کی ماں اللہ کے پاس چلی گئی ہے۔ اگرچہ وہ آسمان سے بھی دور ہے، پھر بھی وہ

ایک پگڈنڈی پر چلتا ہوا جب سوکومار ایک چھوٹے سے گاؤں میں داخل ہوا تو سورج غروب ہو رہا تھا۔ اس کی عمر گیارہ سال تھی۔ دور ہمالیہ کے اونچے پرست سرفخر سے بلند کیے کھڑے تھے جن کی کئی چوٹیاں ابھی بھی سرخ اور سنہری رنگوں میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ سوکومار تنہا تھا اور گاؤں میں کسی کو نہیں جانتا تھا لیکن اسے امید تھی کہ گاؤں میں کوئی تو ایسا ہوگا جو اسے رات اپنے گھر میں رہنے دے گا۔ کچھ فاصلے پر ایک چھوٹی لڑکی اپنی ماں کو آوازیں دے رہی تھی۔ سوکومار کو اپنی ماں یاد آ گئی جو اللہ کو پیاری ہو گئی تھی۔ ماں کے یاد آتے ہی ہمیشہ کی طرح سوکومار نے اپنی بانسری اپنے لبوں سے لگالی، وہ ایسی دھن بجانے لگا جیسے اپنی ماں کو بلا رہا ہو۔ وہ ابھی وہیں کھڑا بانسری بجا رہا تھا کہ ایک ادھیڑ عمر عورت جس نے اپنی کمر پر گھاس کا گٹھا اٹھا رکھا تھا، اس کے پیچھے سے گزری۔ وہ گاؤں کے کھیا کی بیوی تھی۔ اس نے بانسری کی مدھر آواز سنی تو وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

سوکومار کو اس کی موجودگی کا احساس ہوا تو اس نے مڑ کر اسے دیکھا۔ جب دونوں کی نظریں چار ہوئیں تو دونوں کو ایک دوسرے سے شدید انسیت کا احساس ہوا۔ عورت نے پوچھا۔ ”میرے بیٹے! تم کدھر جا رہے ہو؟“ ”ماں! میں یہاں بالکل اجنبی ہوں اور رات گزارنے کے لیے پناہ چاہتا ہوں۔“ سوکومار نے جواب دیا۔ ایسے

ان کے دلوں میں رہتی ہے۔ سوکومار نے اشتیاق سے باپ کو پوچھا کہ کیا وہ کبھی دل ہی دل میں ماں کو ملا ہے تو باپ نے جواب دیا کہ وہ اسے مل سکتا ہے جب وہ بانسری کی دھن بکھیر رہا ہو۔

”تو پھر بابا مجھے بھی ایک بانسری بنا دو تاکہ میں جب اسے بجاؤں تو ماں میرے پاس بھی آجائے۔“

اس کے باپ نے سوکومار کی فرمائش پر سوکومار کو بہت نفاست سے ایک بانسری بنا کر دی اور اسے بجانا بھی سکھا دیا۔ اس کے بابا نے اسے وہ دھنیں سکھائیں جن سے چاندنی کی تعریف کی جاسکے یا پھر بارش کے قطروں کے گرنے سے جو آلاپ تیار ہو۔ اس کے بابا اسے ہمیشہ نصیحت کرتے کہ بانسری دل سے بجاؤ تو تمہاری دھن سن کر تمہاری ماں کی روح خوش ہوگی۔ اب سوکومار ہر وقت بانسری بجانے کی ریاضت کرتا رہتا۔ پھر جیسے ہی وہ نو سال کا ہوا، اس کا والد بھی اس کی ماں کے پاس چلا گیا۔ تنہا اور اداس لڑکے نے بانسری بجانا اگلے چھ ماہ کے لیے بالکل ترک کر دیا۔ اس نے یہ وقت زیادہ تر سسکتے اور بلکتے ہوئے گزارا۔ چوں کہ وہ یتیم ہو گیا تھا، اس لیے اب وہ اپنے چچا کے پاس رہتا تھا۔ اب دوبارہ بانسری بجانے لگا تو لوگ اس کی طرف متوجہ ہونے لگے۔ وہ دل سے بانسری بجاتا تاکہ لوگ اسے پیار کریں۔

سوکومار ابھی مضطرب تھا، آخر اس نے ایک دن بانسری اٹھائی اور اپنے چچا کا گھر بھی چھوڑ دیا اور ایک ایسی راہ پر چل نکلا جس کی کوئی منزل نہ تھی۔ وہ راستے میں جب بھی بانسری بجاتا، لوگوں کی بھیڑ اس کے گھر اکٹھی ہو جاتی۔ لوگ بانسری سن کر سر دھنتے اور ناچتے لیکن پھر بھی سوکومار تنہا تھا کیوں کہ لوگ اسے وہ پیار نہیں دے سکتے تھے جو اسے ماں باپ سے ملا تھا۔ پہلی دفعہ اس عورت نے اسے اپنائیت سے بیٹا کہا تھا اور اسے بھی ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی حقیقی ماں لوٹ آئی ہو۔ وہ دونوں جیسے ہی گھر کے صحن میں داخل ہوئے تو چھوٹی لڑکی گھر کے دالان میں گھوم رہی تھی۔ وہ اس عورت کی بیٹی تھی اور اس کا نام سایا پتری تھا۔ عورت نے سوکومار کی طرف اشارہ کر کے اسے بتایا کہ بیٹی میں تمہارے ساتھ رہنے کے لیے تمہارا بھائی لائی ہوں۔ دونوں بچے پہلے تو چپ چاپ شرمائے ہوئے کھڑے رہے لیکن اندر سے دونوں ہی بہت خوش تھے۔ سایا پتری کا کوئی بھائی نہیں تھا اور اس طرح سوکومار کی کوئی بہن نہیں تھی۔

پھر وہ گھر میں داخل ہوئے اور سوکومار چولہے کے قریب بیٹھ کر عورت کو شام کا کھانا بناتے دیکھنے لگا۔ اسے ایک روحانی خوشی ہو رہی تھی جو اسے بڑی دیر بعد ملی تھی۔ کچھ دیر بعد گاؤں کا مکھیا بھی آ گیا۔ اس نے کچھ کہا تو نہیں مگر ایسی عجیب نظروں سے سوکومار کو دیکھا کہ وہ بے چین ہو گیا۔ عورت نے اپنے خاوند کو بتایا کہ سوکومار اسے سڑک پر ملا تھا اور وہ بانسری بہت خوب بجاتا ہے۔ کھانے پر بھی مکھیا نے سوکومار کے متعلق کوئی بات نہیں کی۔ جب کھانا ختم ہوا تو سوکومار نے اپنی بانسری اٹھائی اور اسے آہستگی سے بجانے لگا۔ مکھیا کا خاندان سوکومار کے قریب بیٹھ گیا اور انہماک سے موسیقی سننے لگا۔

مکھیا اور اس کی بیوی کو لگا کہ بانسری کی آواز ان کے دل کو چھو رہی ہے۔ سایا پتری کو محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اس کا بھائی بانسری کی دھن سے ان کے پورے خاندان سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ جب وہ بانسری بجاتے تھک گیا اور سونے کے لیے اٹھا تو مکھیا کی بیوی نے پیار سے اس کے ماتھے کو چوما اور اسے کہا کہ میرے بیٹے شب بخیر۔ صبح سوکومار جلدی سے اٹھا اور جانے کی تیاری کرنے لگا لیکن مکھیا کی بیوی نے اسے روک لیا اور کہنے لگی کہ ہم ماں اور بیٹا ہیں، میں تمہیں جانے نہیں دوں گی۔ سوکومار اس کے اصرار پر وہیں رک گیا۔ سایا پتری، سوکومار سے بہت پیار کرتی تھی مگر کئی دفعہ سوکومار کا رویہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ وہ حیران تھی کہ سوکومار کبھی مسکرایا کیوں نہیں؟ ایک دن دونوں بچے ندی کے کنارے کھیلنے گئے۔ حسب معمول سوکومار ندی کے کنارے افسردہ بیٹھا پانی کو گھور رہا تھا۔ سایا پتری سے رہا نہیں گیا۔ اس نے سوکومار سے اس کی افسردگی کے بارے میں پوچھا تو سوکومار نے اپنے والدین کے بارے میں سایا پتری کو بتایا۔

سوکومار نے بھی بانسری بجانے کی وجہ یہ بتائی کہ صرف اس طرح وہ اپنے والدین کو دل ہی دل میں مل سکتا ہے۔ سایا پتری کے دل کو دھچکا سا لگا۔ اس نے سوکومار سے پوچھا کہ کیا وہ اسے اپنی بہن نہیں سمجھتا اور کیا اس کے ماں باپ سوکومار کے ماں باپ نہیں ہیں؟ سوکومار نے اسے سمجھایا کہ وہ اس کی بہن ہے اور سایا پتری کی ماں اس کی ماں ہے لیکن ابھی وہ سایا پتری کے مکھیا والد کا دل نہیں جیت سکا ہے۔ سایا پتری نے سوکومار کو کہا کہ وہ اپنے باپ سے بات کرے گی مگر سوکومار نے منع کر دیا اور اسے کہا کہ وہ بانسری کی دھن

سے لکھیا کا دل جیتے گا۔ رات جب دونوں بچے سو گئے تو لکھیا نے اپنی بیوی کو سمجھایا کہ یتیم بچوں کا کوئی آگاہیچھا نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ قابل اعتبار نہیں ہوتے۔ کسی دن سوکومار بھی بتلائے بغیر تمہیں چھوڑ جائے گا تو سایا پتری اور تمہیں دکھ ہوگا مگر لکھیا کی بیوی نے سختی سے لکھیا کی بات رد کر دی۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ اگر وہ یتیم ہے تو یہ اس کا قصور نہیں ہے، اس لیے انہیں تو اس کے ماں باپ بننا چاہیے۔

زندگی ایسے ہی گزرتی رہی اور موسم بہار آگیا، تمام پودوں کی شاخیں پھولوں سے لد گئیں۔ گاؤں میں موسم بہار کے جشن کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ نیپال میں اس جشن کو گھٹو کہتے ہیں۔ ایک شام سوکومار اپنے کمرے کی کھڑکی سے پورے چاند کو دیکھ رہا تھا۔ بادل اُٹ رہے تھے، چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ سوکومار نے بے اختیار اپنی بانسری اٹھائی اور بجانا شروع کر دی۔ فضا میں ہر طرف سوکومار کی موسیقی بکھر گئی تھی لیکن جب اس نے بانسری بجانا ختم کی تو اداسی اس کے سارے جسم میں سرایت کر چکی تھی۔ وہ ابھی تک سایا پتری کے والد کا دل نہیں جیت سکا تھا۔ اسے ہر کام ناممکن لگ رہا تھا۔ آخر اس نے صبح منہ اندھیرے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ گھر سے باہر نکل کر حسرت سے اس نے واپس دیکھا۔ دل ہی دل میں اس نے سایا پتری اور اس کی ماں کو خدا حافظ کہا اور روانہ ہو گیا۔ صبح سورج نکلنے تک وہ پہاڑ کی چوٹی پر اخروٹ کے درختوں کے درمیان پہنچ گیا تھا۔ ایک دفعہ اسے ایسے لگا جیسے سایا پتری اسے آواز دے رہی ہے۔ سارا دن وہ پہاڑوں اور وادیوں سے گزرتا رہا۔ آخر شام کو وہ ایک اور چوٹی پر پہنچا جہاں اس نے ایک عبادت گاہ دیکھی۔ اس نے رات وہیں گزارنے کی ٹھانی۔ یہاں اس نے خود کو بہت اکیلا محسوس کیا۔ اسے ایسے لگ رہا تھا جیسے سایا پتری کے گھر سے دور ہو کر ایک دفعہ پھر وہ اپنے ماں باپ سے علیحدہ ہو گیا ہے۔

سوکومار نے بانسری بجانے کی کوشش کی مگر وہ ایسا کر نہ سکا۔ وہ وہاں بیٹھ گیا اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ جب صبح وہ جاگا تو سورج کی کرنیں لکڑی کی دیوار کی درزوں سے چھن چھن کر عبادت گاہ میں آرہی تھیں۔ اس نے دیکھا کہ عبادت گاہ میں ایک مجسمہ بنا ہوا ہے جس کے ہاتھوں کی بناوٹ ایسے تھی جیسے وہ اسے اپنی گود میں لینے کے لیے بلا رہی ہے۔ اسے مجسمے میں بھی سایا پتری اور اس کی ماں کی شبابہت نظر آئی۔ وہ اب گوگو کے عالم

میں تھا کہ اسے سفر جاری رکھنا چاہیے یا واپس اپنی بہن کے پاس چلا جانا چاہیے۔ وہ وہاں سے نکلا اور ایک بڑے درخت کے نیچے بیٹھ کر سوچنے لگا۔ اگلی رات بھی اس نے وہیں گزاری لیکن سایا پتری ہر لمحہ اسے یاد آتی رہی۔ خواب میں بھی وہ سایا پتری سے کچھ کہنے لگا تو اس نے انگلی سے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ صبح اٹھا تو فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ اپنی بہن کے پاس واپس جائے گا۔ وہ پورا سال سایا پتری کے خاندان کے ساتھ رہا تھا۔

پہلی بار سوکومار نے سایا پتری کو تلسی کے پودے کے قریب دیکھا تھا۔ جب وہ واپس سایا پتری کے گھر پہنچا تو وہاں بہت سے لوگ اکٹھے تھے اور سبھی افسردہ تھے۔ خاموشی سے سوکومار گھر میں داخل ہوا، اندر سایا پتری اپنی ماں کی آغوش میں لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی ماں نے سوکومار کو دیکھا تو چلا کر بولی۔ ”میرے بیٹے! تم کہاں چلے گئے تھے؟ دیکھو تمہارے بغیر تمہاری بہن کتنی بیمار ہو گئی ہے۔ لوگ کہتے ہیں وہ ٹھیک ہو جائے گی مگر مجھے یقین نہیں آتا۔“ سوکومار آہستہ سے بہن کے پاس پہنچا، اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے آہستگی سے سایا پتری کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ ماں نے سوکومار کو بتایا کہ وہ جس رات گھر سے گیا ہے، سایا پتری کو سخت بخار نے گھیرا ہوا ہے۔ لگتا ہے جیسے اس کی روح بدن سے نکل کر اپنے بھائی کی تلاش میں روانہ ہو گئی تھی۔ اب تم آگئے ہو تو امید ہے کہ تمہاری بہن صحت یاب بھی ہو جائے گی۔ سوکومار ساکن بیٹھا رہا، پھر اس نے دوسرے ہاتھ سے بانسری نکالی اور آہستگی سے اسے بجانا شروع کر دیا۔ جیسے ہی بانسری کی آواز کمرے میں گونجی، سایا پتری کے جسم میں حرکت ہوئی اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔

لکھیا جو پاس ہی بیٹھا ہوا تھا، اس نے اپنے بیٹی کو تھوڑا سا پانی پلایا۔ سایا پتری نے سوکومار کو دیکھا تو بے اختیار بڑبڑائی۔ ”میرے بھائی! آخر تم آ ہی گئے۔“ بانسری سوکومار نے پرے رکھ دی اور سایا پتری کو کہا۔ ”ہاں! میری بہن، میں تمہارے پاس آ گیا ہوں۔“ اسی لمحے لکھیا جس کی آنکھوں میں آنسو تھے، نے سوکومار کو گلے سے لگا لیا۔ ”تم میرے حقیقی بیٹے ہو، اب میں تمہیں کہیں جانے نہیں دوں گا۔“ اس نے سوکومار کو پیار سے کہا۔ سایا پتری اور سوکومار ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیے۔ لوگ کہتے ہی ایسی ہی ایک کہانی پر نیپال میں گھٹو کا جشن منایا جاتا ہے جس میں تمام نیپال کے تمام لوگ حصہ لیتے ہیں۔

☆☆

اس تصویر کا اچھا سا عنوان تجویز کیجئے اور 500 روپے کی کتب لیجئے۔
عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 10 مئی 2014ء ہے۔

بلا عنوان



اپریل 2014ء کے ”بلا عنوان کارٹون“ کے لیے جو عنوانات موصول ہوئے، اُن میں سے مجلسِ امداد کو جو عنوانات پسند آئے، اُن عنوانات میں سے یہ ساتھی بہ ذریعہ قرعہ اندازی 500 روپے کی انعامی کتب کے حق دار قرار پائے۔



(محمد طلحہ خالد، واہ کینٹ)
(طلحہ ہما، فیصل آباد)
(عائشہ آصف، واہ کینٹ)
(حسن رضا سردار، کاموکی)
(شہزادی خدیجہ شفیق، لاہور)

▶ جلد بازی کتنی خطرناک، ساکٹ بنادی شوہر کی ناک۔
▶ عقل نہیں تے موجاں ای موجاں، عقل اے تے سوچاں ای سوچاں۔
▶ پلگ جب لگا دیا ناک کے اندر، اب حیرت سے کیا دیکھتی ہو جو سر کے اندر۔
▶ لائٹ نہیں تو پھر کیا؟ عقل لڑا اور کام چلا۔
▶ کبھی نہیں جوس بنے گا، آدمی کے خراٹوں سے۔